ترقی اور افلاس



سید صدیق الحسن گیلانی

ترقی اور افلاس

سید صدیق الحسن گیلانی ایم۔ اے

ایوانِ ادب، چوک اردو بازار، لاہور

●

طبع اوّل : جون ۱۹۶۹ء

تین ہزار

●

قیمت : سفید کاغذ مجلّد : تین روپے

پیپر بیک نیوز پرنٹ : دو روپے

نام کتاب : "ترقی اور افلاس"

مصنّف : سیّد صدّیق الحسن گیلانی

عملِ سرورق : مصباح الایمان

خوش نویس : محمد ریاض خاں

مطبع : اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور

باہتمام : حفیظ احسن ایم اے

ناشر : ایوانِ ادب، چوک اردو بازار، لاہور

فہرستِ مضامین

باب دوم۔ غیر ملکی سرمایہ کاری

باب سوم۔ ترقیاتی منصوبے

چہارم:
زرعی پالیسی

باب پنجم : صنعتی ترقی

باب ششم : اسلام آباد

باب ہفتم: پاکستان کے لیے عبوری معاشی نظام

ضمیمے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پاکستان میں سرمایہ داری نظام نے صرف بیس سال میں وہ نتائج دکھا دیے ہیں جو یورپ میں یہ نظام دو تین صدیوں میں بھی نہ دکھا سکا۔ اس کمالِ فن کے لیے حکمرانوں کو داد دی جائے یا افسر شاہی کو، سرمایہ داروں کی خونخواری کو اس کا سبب قرار دیا جائے یا لائسنسوں، پرمٹوں کی پالیسی کو، بہرحال اس کمالِ فن کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ بیس سال میں دولت سمٹ کر بیس بائیس خاندانوں کے اندر جمع ہو گئی ہے اور افلاس نے پھیل کر بارہ کروڑ عوام کو اپنے نرغے میں لے لیا ہے۔

ترقیات پر بہت فخر کیا جاتا ہے اور اس کے لیے مغربی ممالک کے بعض ماہرین کی رائے کو بطورِ سند بھی پیش کیا جاتا ہے لیکن تصویر کا صرف ایک رُخ ہی لوگوں کو دکھایا جا رہا ہے اور اس کی تشہیر اخبارات، ریڈیو، وزرا کی تقریروں اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع سے کی جا رہی ہے لیکن اس ترقی کی تصویر کا ایک دُوسرا رُخ بھی ہے جسے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اسی دُوسرے رُخ پر سے ذرا سا پردہ ہٹایا گیا ہے۔ تصویر کا ایک رُخ یہ ہے کہ واپڈا نے ۵½ کروڑ

روپیہ صرف کر کے ایک عظیم الشان بلڈنگ اپنے دفاتر قائم کرنے کے لیے بنائی ہے اور اس تمام بلڈنگ کو ایر کنڈیشن کیا گیا ہے۔ لیکن دفاتر کا ایک بڑا حصّہ ابھی تک بکھرا ہوا ہے اور اس عظیم بلڈنگ کے کچھ حصّے کرائے پر دیے گئے ہیں اور دفاتر بدستور کرائے کی بلڈنگوں میں ہیں۔ پھر جن دانشمندوں نے یہ عظیم بلڈنگ بنانے کا منصوبہ بنایا ان کے پیشِ نظر اگر صرف نمائش نہ ہوتی بلکہ فی الواقع ملک کی فلاح ہوتی تو وہ ڈھائی تین کروڑ روپیہ صرف کر کے دفاتر تعمیر کرتے اور ڈھائی تین کروڑ روپے سے ملازمین کے کوارٹر تعمیر کرتے جس سے ہزاروں ملازمین کو سہولت بھی میسر ہوتی اور دفاتر بھی قائم ہو جاتے۔ موجودہ بلڈنگ تو محض شور ودم ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ بجلی اور پانی کی ضرورت کا احساس کر کے کروڑہا روپیہ صرف کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور صحیح فیصلہ کیا گیا لیکن لائل پور، ملتان، گوجرانوالہ، لاہور اور روہڑی کے تمام اسٹیشن جس طرح بار بار خراب ہوئے ہیں اور کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا ہے پھر ان کی مرمت کے لیے بھی غیر ملکی ماہرین اور کل پرزوں کے لیے بھی ہم دوسرے ممالک کے محتاج ہیں، یہ کوئی قابلِ فخر کارکردگی نہیں ہے۔ لاکھوں ایکڑ اراضی کا کروڑوں روپے کے خرچ سے آبپاشی کا انتظام ہوا اور ہزاروں کاشت کار خاندان اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا تھا لیکن اراضی کا بیشتر حصّہ خود سرکاری افسروں اور وزرا کو برائے نام قیمت پر تقسیم کر دیا گیا۔ صنعتی ترقی ہوئی لیکن گنتی کے خاندانوں کے اندر دولت جمع ہو گئی۔ مزدور کو ہڑتال کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تاکہ کارخانہ دار کے لیے انسان بھی ایک مشین بن کر رہے۔ ٹرانسپورٹ میں اضافہ ہوا لیکن روٹ پرمٹ حاصل

کرنے والے دلال بھی آموجود ہوئے اور عام آدمی کو بس میں سفر کرتے ہوئے اس دلال کا حصّہ بھی ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ وُہ طبقے اور گروہ جو اپنے ذاتی اثر و رسوخ یا سیاسی اثرات کے تحت معاشی وسائل پر ناجائز طور پر قابض ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور سود، سٹہ، لائسنس، پرمٹ کے ذریعہ سرمایہ داری کا بازار گرم کیے لوگوں کے حقوق، اور عزّت و آبرو سے کھیل رہے ہیں، ان کے شیطانی چکّر کو کس طرح ختم کیا جائے اور وُہ کون سی ممکن تدابیر ہیں جنھیں اختیار کر کے معاشرے کے بالکل دبے ہوئے طبقوں کو مواقع مہیّا کیے جائیں کہ وہ اپنی محنت سے رزقِ حلال حاصل کر سکیں اور ان کی گردنیں سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سرکاری افسروں کے پنجے سے نکل سکیں تاکہ وُہ اپنے رازقِ حقیقی کے سامنے جھک سکیں۔

جس طرح پچھلے بیس سال میں بددیانتی، رشوت اور حرامخوری کو فروغ حاصل ہوا ہے، اس سے بجا طور پر یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ دیانتداری، شرافت، خدا ترسی اور سلامت روی کی اعلیٰ صفات ختم ہو جائیں، ان صفات کے حامل لوگ بھی تباہ و برباد ہو جائیں، پوری قوم کا دینی اور تہذیبی سرمایہ خاک میں مل جائے اور کسی "نئی سازش" کا شکار ہو کر یہ قوم اُس مقصدِ عظیم کو بھی نقصان پہنچائے جس کے لیے پاکستان قائم ہُوا تھا اور جس مقصد کے حصول کی آرزو پر ہی پاکستان کی سلامتی کا دارومدار ہے۔

میرا مقصد محض نظام سرمایہ داری کی خرابیوں اور اس نظام کی پیدا کردہ معاشی ناہمواریوں کو بالکل عام فہم انداز میں پیش کرنا ہے اور جہاں کہیں کسی فرد یا ادارے

یا صنعتی ادارے کا ذکر آیا ہے محض مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے کسی کے خلاف نفرت پھیلانا مقصود نہیں، اور نہ کسی خاص دورِ حکومت کو مطعون کرنا ہے۔ اللہ کرے میرا یہ احساس غلط ہو لیکن میں بڑی شدّت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے آگے بڑھ کر ان معاشی ناہمواریوں کو رفع کرنے، بگڑتے ہوئے اخلاق کو سنبھالنے اور پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کی فوراً بھرپور جدّوجہد نہ کی تو "سوشلزم" قہرِ خداوندی کی شکل میں آئے گا اور پوری قوم ایک "نظریاتی آمریّت" کی غلام ہو جائے گی۔ یہی سرمایہ دار اس آمریت کے ایجنٹ بن کر ایک دوسرے روپ میں لوگوں پر مسلّط ہو جائیں گے اور موجودہ روش سے ہزار گنا زیادہ سفّاک ثابت ہوں گے بعض سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے تو ابھی سے راہ ہموار کرنا شروع کر دی ہے اور دوسرے اپنا سرمایہ دوسرے مغربی ممالک میں منتقل کر رہے ہیں۔

جو صنعتی ادارے اور کارخانے قائم ہوئے ہیں وہ ملک کی متاعِ عزیز ہیں اور انہیں ہر حالت میں قائم رکھنا اور ترقی دینا ہمارا فرض ہے لیکن ان اداروں کو چند لوگوں کے لیے دولت سمیٹنے اور دولت کو باہر منتقل کرنے کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دی جا سکتی اور یہی وہ خرابی ہے جس کی نشاندہی اس کتاب میں کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عدل و انصاف قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

صدیق الحسن گیلانی

بابِ اوّل

غیر ملکی قرضے

غیر ملکی قرضوں پر تبصرہ کرتے ہوئے منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین جناب ایم ایم احمد صاحب نے فرمایا تھا کہ :

"قرضے کا دھماکہ آبادی میں اضافے کے دھماکے سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔"

"قرضوں (جسے امداد کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کا پچاس فیصد تو قرض دینے والے ملک کو ویسے ہی واپس چلا جاتا ہے، سود اور فنّی مشوروں (جسے سروس چارج کہا جاتا ہے) کی شرح بڑھ کر بارہ فیصد ہو چکی ہے، جو برآمد میں اضافے کی شرح سے کہیں زیادہ ہے۔" (ڈان، مورخہ ۲۰ نومبر ۶۶ء)

ایم ایم احمد صاحب نے نومبر ۶۶ء میں کولمبو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا، اور کسی ملک کے نمائندے نے اس کی تردید کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ملک قرض دیتا ہے وہ مقررہ رقم کا سامان مہیا کرتا ہے اور سامان مہیا کرتے وقت اس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیتا ہے پھر کچھ ایسی پابندیاں عاید کر دی جاتی ہیں جو قرض لینے والے ممالک کے لیے اقتصادی طور پر تو شدید نقصان کا باعث ہوتی ہی ہیں،

سیاسی طور پر بھی یہ قرضے بہت سی پابندیاں لے کر آتے ہیں۔

امریکہ جو سب سے زیادہ قرضے دیتا ہے، اس کی ذہنیت کا اندازہ کرنے کے لیے حکومت پاکستان کے ایک ذمہ دار افسر جناب فضل الرحمٰن خاں صاحب کی رپورٹ کا ایک اقتباس قابلِ غور ہے۔ وُہ فرماتے ہیں:

"وُہ (امریکن) صرف اپنے مفاد اور معاملات میں دلچسپی رکھتے ہیں، وہ صرف اپنے مفاد کے زاویۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جب کسی مُلک کو اقتصادی یا فوجی امداد کی پیش کش کی جاتی ہے تو اس کا مقصد محض اپنا فائدہ ہوتا ہے تاکہ فالتو سامان کو ٹھکانے لگایا جا سکے اور صنعت کو ترقی دی جا سکے۔"

(کارروائی قومی اسمبلی، مورخہ ۴ر جون ۶۸ء)

سیاسی اور نظریاتی مفاد

کنڈل برگ مشہور امریکی مصنف اپنی کتاب "اکنامک ڈویلپمنٹ" میں امداد (قرض) کی شرائط پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"امریکی کانگریس میں ایسے گروپ موجود ہیں جو بین الاقوامی امداد (قرض) کو فوری فوائد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ امداد بعض دفعہ صرف امریکی مفاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ ڈیفنس کے لیے خام مال حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے یا حکومت کو کچھ دُوسرے مقاصد کے لیے قرض دار مُلک کی کرنسی درکار ہوتی ہے، ان معمولی مفادات کے علاوہ امداد کے اندر یہ فطری کمزوری موجود ہے

کہ اسے سودا بازی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی اور نظریاتی مفاد بھی حاصل کیا جاتا ہے۔"

(اکنامک ڈویلپمنٹ، ص ۴۲)

جناب فضل الرحمٰن خاں صاحب اپنی رپورٹ میں مزید فرماتے ہیں کہ:

"امریکی امداد صرف پاکستان کی ترقی و استحکام کے خیال سے نہیں بلکہ امریکی مفاد کے پیش نظر دی گئی ہے۔ امریکی امداد ایشیا میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے اور پاکستان میں ایسے اڈے قائم کرنے کی پالیسی کے تحت دی گئی، جو روس کے خلاف قائم کیے گئے۔ علاوہ ازیں اپنی مصنوعات اور فالتو غذائی پیداوار کو پاکستان کے ہاتھ فروخت کرنے کے لیے امداد دی جاتی رہی۔ یہ سلسلہ امریکہ کے لوگوں کے لیے کم منافع بخش نہیں تھا۔" (رپورٹ فضل الرحمان خان آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی)

(کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۴ جون ۶۸ء)

پاکستان کی قربانیاں

امریکہ نے تجارت اور کاروبار کے معاملے میں دوست اور دشمن میں کبھی تمیز نہیں کی، کیونکہ غذائی اجناس، فوجی امداد اور نقدی کی صورت میں قرضے دینے کے سلسلہ میں اس نے تمام جانبدار حتیٰ کہ کمیونسٹ ملکوں کو بھی امداد دی ہے، جہاں کہیں اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ امداد امریکہ کے حق میں مفید ہے۔ دوسری طرف پاکستان کو امداد کے معاہدوں کی وجہ سے ملک کے اندر اور باہر سے بہت سی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اور مسئلہ کشمیر پر امریکی سرد مہری اور روس کی ہندوستان کو کشمیر کے معاملے میں اعانت پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"پاکستان کو امریکہ سے دوستی قائم رکھنے اور معاہدات کرنے کے لیے بہت زیادہ قربانیاں دینا پڑی ہیں۔"

پاکستان نے فوجی معاہدوں کے علاوہ امریکہ کو پاکستان میں اپنا اڈہ قائم کرنے کی بھی اجازت دی جبکہ ہندوستان نے امریکہ کو ریڈیو اسٹیشن تک قائم کرنے کی اجازت نہ دی اور یہ اجازت اس وقت بھی نہ دی جبکہ وہ امریکہ سے بے شمار فوجی اور اقتصادی امداد حاصل کر چکا تھا۔

قرضے کی شرائط

ہر قرضہ پر مختلف شرائط عاید کی جاتی ہیں اور منصوبہ بندی کے بڑے نقصانات میں سے ایک نقصان یہ ہے کہ منصوبہ کی ضروریات پورا کرنے کے لیے جب پلاننگ کا عملہ قرضے مانگنے کے لیے جاتا ہے تو ان کی مجبوریوں کی داستانوں کو سن کر قرض کی شرائط کو اور زیادہ سخت کر دیا جاتا ہے۔

قرض نمبر ۱۱۵ کی شرائط

قرض کی شرائط کو سمجھنے کے لیے صرف ایک قرضے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں۔ یہ قرض نمبر ۱۱۵ ہے جو امریکہ سے حاصل کیا گیا۔

۱۔ کل رقم ۵ کروڑ ڈالر

۲۔ اصل زر اور سود پاکستان کو امریکی ڈالر میں ادا کرنا ہوگا اور مدت ۴۰ سال ہوگی۔

۳۔ قرض کی ادائیگی کی شرائط کے معاملے میں پہلے سود کی ادائیگی ضروری ہوگی اور بعد میں اصل زر کی۔

۴۔ پاکستان اس قرض میں ۷ کروڑ ڈالر کی زرِ مبادلہ کی رقم کا مزید اضافہ کرے گا۔ یہ رقم امریکہ کے علاوہ دُوسرے ذرائع سے حاصل کی گئی ہو اور اس رقم سے بھی وُہی اشیاء امریکہ سے حاصل کرے گا، جن کا ذکر اس قرض میں کیا گیا ہے۔

۵۔ یہ قرض یکم مارچ ۱۹۶۶ء سے شمار ہوگا۔

۶۔ کیمیاوی کھاد، جو اس قرض کے تحت درآمد کی جائے گی اسے کپاس کی پیداوار میں اضافے یا درآمد میں کمی کا باعث نہیں بننے دیا جائے گا (مراد یہ ہے کہ کپاس کے لیے استعمال نہیں کی جائے گی۔ پی ایل ۔ ۴۸۰ کے تحت جو معاہدہ ہُوا ہے اس میں یہ معاہدہ موجود ہے کہ پاکستان ۳ ہزار ٹن کپاس امریکہ سے ہر سال خریدے گا)۔

(کارروائی قومی اسمبلی مؤرخہ ۲۱ مئی ۶۸ء)

ان شرائط کے تحت ۵ کروڑ ڈالر کا قرضہ ملا ہے اور ان ۵ کروڑ ڈالر کی جو اشیاء مہیا کی جائیں گی، وُہ درج ذیل ہیں۔ یاد رہے کہ یہی اشیاء اسی نسبت سے مزید ۷ کروڑ ڈالر نقد ادا کر کے بھی خریدنا ضروری ہے۔

نام اشیاء	قیمت
۱۔ جیپ گاڑی سرکاری	۵ لاکھ ڈالر برائے فیملی پلاننگ
۲۔ جیپ گاڑیاں پرائیویٹ	۱۵ لاکھ ڈالر

۳۔ لوہا اور فولاد پرائیویٹ	۹۰ لاکھ ڈالر
۴۔ جراثیم کش ادویہ سرکاری	۸۰ لاکھ ڈالر
۵۔ ادویات پرائیویٹ	۱۵ لاکھ ڈالر
۶۔ کیمیاوی اشیا پرائیویٹ	۱۵ لاکھ ڈالر
۷۔ روغنیات پرائیویٹ	۴۰ لاکھ ڈالر
۸۔ ٹیلیگراف کا سامان سرکاری	۵ لاکھ ڈالر
۹۔ دھاتیں	۳۰ لاکھ ڈالر
۱۰۔ کھاد سرکاری	۲ کروڑ ڈالر
۱۱۔ مشینری اور پرزے پرائیویٹ	۵ لاکھ ڈالر
کل میزان	۵ کروڑ ڈالر

عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ امریکہ اشیا مہیا کرنے والے قرضے (اکماڈیٹی لون) کے تحت اشیا کی قیمتیں ۳۳ فیصد سے ۷۰ فیصد تک بڑھا دیتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیرمین جناب ایم ایم احمد صاحب فرماتے ہیں کہ ۵۰ فیصدی رقم اس طرح واپس چلی جاتی ہے۔ اب اس قرض نمبر ۱۱۵ کی شرائط کو دیکھیے تو صورتِ حال یہ ہو گی کہ کل بارہ کروڑ ڈالر کا مال ہم خریدیں گے، اس میں سے ۷ کروڑ ڈالر نقد ادا کریں گے، اور ۵ کروڑ ڈالر قرض مال لیں گے۔ ۱۲ کروڑ کے سودے میں سے ۶ کروڑ ڈالر تو امریکہ لے جائے گا، ۶ کروڑ ڈالر کا سامان ہمیں ملے گا، اور ۵ کروڑ ڈالر کا قرض بھی واجب الادا رہے گا اور اس پر سود بھی ہمیں ادا کرنا ہو گا۔ اس قرض کی میعاد ۴۰ سال ہو گی، اور سود کی شرح ڈھائی فیصد یعنی ساڑھے

بارہ لاکھ ڈالر سالانہ سُود بھی باقاعدہ ادا کرنا پڑے گا۔ درآنحالیکہ ۶ کروڑ ڈالر امریکہ نقد وصول بھی کر چکا ہے۔

صدرِ مملکت کی تشویش

جس طرح قرض دینے والے ممالک اشیاء کی قیمتیں بڑھا رہے ہیں اس پر خود صدرِ مملکت نے یکم نومبر ۱۹۶۷ء کی تقریر میں شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"قرض دینے والے ملکوں نے اپنے سارے سامان کی قیمتیں بڑھاتے چلے جانے کی پالیسی جاری رکھی ہے۔"

امریکی ادارۂ امداد کی رپورٹ

امریکی ادارہ AID کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت لاہور اپنی ۱۱ رمئی ۱۹۶۷ء کی اشاعت کے اداریہ میں "رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی" کے عنوان سے لکھتا ہے:

"دُوسرے ملکوں کے لیے امریکی امداد امریکہ کے لیے بہترین فروغِ برآمد سکیم ثابت ہو رہی ہے — یہ بات امریکہ کے کسی مخالف و نقاد نے طنز و تعریض کے پیرایہ میں نہیں کہی بلکہ یہ بات امریکی امداد کے نگران ادارہ (AID) کی طرف سے ایک رپورٹ میں کہی گئی ہے، جس میں دُوسرے ملکوں کو امریکی امداد کی امریکہ کے لیے افادیت واضح کی گئی ہے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ء تک یہ حالت تھی کہ امریکہ دُوسرے ملکوں کو جو امداد دیتا تھا اس کا صرف بیس فیصد امریکہ کے حصّے میں آتا تھا یعنی اسی تناسب سے امریکہ سے خام مال، مشینری، ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ لیکن

۱۹۶۴ء میں یہ تناسب ۸۰ فیصد تک بڑھ گیا اور اس بات کی قوی توقع ہے کہ ۶۵ء کے اواخر تک یہ تناسب ۹۰ فیصد تک بڑھ جائے گا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دُوسری جنگِ عظیم کے بعد جن یورپی مُلکوں کو بحالی و تعمیرِ نو کے لیے امریکہ نے امداد دی، اگرچہ اب وُہ ملک امریکی امداد کے محتاج اور ضرورت مند نہیں رہے لیکن اس دوران میں امریکہ سے ان کی تجارت سو فیصدی بڑھ چکی ہے۔

اِس تفصیل سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ امریکی امداد کے نگران ادارہ نے جو بات کہی ہے یعنی "دُوسرے مُلکوں کے لیے امریکی امداد امریکہ کے لیے بہترین فروغِ برآمد سکیم ثابت ہو رہی ہے" اس میں کوئی مُبالغہ یا افسانہ طرازی نہیں ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق اس ادارہ کی طرف سے اس تازہ وضاحت سے بھی ملتی ہے کہ امریکہ نے اس سال دُوسرے ملکوں کی امداد کے لیے ۳ ارب ۳۰ کروڑ ڈالر مخصوص کیے ہیں، لیکن اس خطیر رقم کا بیشتر حِصّہ (۳ ارب ۵ کروڑ ڈالر) امریکہ سے ہی خام مال، مشینری، ماہرین کی خدمات وغیرہ کے سلسلہ میں صرف ہو گا۔

۱۹۶۵ء میں صُورتِ حال یہ تھی کہ امریکی قرض کا نوّے فیصدی فائدہ خود امریکہ اٹھاتا تھا، لیکن بعد کے سالوں میں حالات اَور بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ ۵ کروڑ ڈالر کا قرض، بارہ کروڑ ڈالر کا سُود جس میں سات کروڑ ڈالر نقد ادا کرنا ضروری ہے گویا قرض پانچ کروڑ ڈالر مع سُود تو قائم رہا اور ۶ کروڑ ڈالر منافع بھی امریکہ نے کمایا اَور قرض اور سُود کے گرداب میں بھی ہم پھنسے رہے۔

۱۹۶۰ء سے پہلے امریکہ قرضے دے کر صرف ۲۰ فیصد کماتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وُہ یورپ کے ممالک کو بحالی کے پروگرام کے تحت قرض دے رہا تھا۔ بعد

ازاں جب یہ سلسلہ افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کے لیے شروع کیا گیا تو امریکہ نے ۸۰ فیصدی اور ۹۰ فیصدی کمانا شروع کیا اور پاکستان کے قرضوں کی شرائط پر غور کیا جائے تو امریکہ سو فیصد سے بھی زیادہ کما رہا ہے۔

اب قرضوں کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے امریکہ کے سفارت خانے کی وضاحت بھی پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

امریکی سفارت خانے کی وضاحت

امریکی سفارت خانے کے پریس اتاشی نے پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۰ اگست اور ۲۳ اگست ۱۹۶۸ء میں شائع شدہ دو طویل مقالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ وضاحت کی ہے کہ "اِن دو مقالوں میں یہ غلط تاثرات دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکہ کی امداد پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ختم ہوتی جا رہی ہے اور یہ کہ امریکی امداد امریکی مفاد کو بہت زیادہ پیش نظر رکھ کر دی جاتی ہے اور اشیاء کی فراہمی انتہائی گراں نرخوں پر کی جاتی ہے۔"

پاکستان اکنامک سروے جو وزارتِ مالیات کی تیار کردہ ہے، اس کے مطابق حقائق یہ ہیں:

"امریکی امداد کی کُل مقدار اس تمام امداد سے جو دوسرے ملکوں سے ۱۹۶۸ء میں حاصل کی گئی ہے چالیس فیصدی زیادہ ہے اور پچھلے دو سال میں جو امداد امریکہ کی طرف سے دی گئی ہے وہ بھی دوسرے تمام ممالک کی مجموعی امداد سے پچیس فیصدی زیادہ ہے۔"

"یہ بھی کہا گیا تھا کہ پروجیکٹس کے لیے ۶۵-۱۹۶۴ء کے بعد کوئی قرض دینے

کا وعدہ نہیں کیا گیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنوری ۱۹۶۶ء کے بعد پندرہ ایسے معاہدات ہو چکے ہیں اور ۱۰ کروڑ ڈالر تک کی رقم کے معاہدات پر دستخط ہو چکے ہیں۔"

قیمتوں میں اضافے کا اعتراف

"اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ امریکہ تمام اشیاء بہت گراں نرخوں پر دیتا ہے، خصوصاً فولاد جو بین الاقوامی مارکیٹ کی قیمتوں کے مقابلے میں ۷۰ سے ۱۰۰ فیصد زیادہ قیمت پر مہیا کیا جاتا ہے، حکومت پاکستان پر کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ امریکہ کی اشیاء اور فولاد خریدے اور فراہمی اشیاء کے لیے قرض مانگے اور اگر حکومت پاکستان مہنگے نرخوں پر خریدتی ہے تو اس کا کوئی سبب ہوگا۔"

(پاکستان ٹائمز ۲۹۔ اگست سنہ ۱۹۶۸ء)

قرض کی تفصیلات

۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء تک کل قرض کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

کل رقم ۳۸۲۲ ملین ڈالر = ۱۸ ارب ۴۳ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے

یہ رقم مرکز اور صوبوں میں جس طرح استعمال ہوئی اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مرکزی طور پر ۱۴۷۰ ملین ڈالر = ۷ ارب ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے

۲۔ مشرقی پاکستان میں۔ ۸۳۰ ملین ڈالر = ۳ ارب ۹۸ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے

۳۔ مغربی پاکستان میں۔ ۱۵۲۲ ملین ڈالر = ۷ ارب ۳۰ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے

اس قرض کی کل رقم کو اگر بونس ووچر کی شرح (۱۶۵) کے حساب سے شمار کیا جائے، کیونکہ ہمارے روپے کی حقیقی قدر و قیمت وہی ہے اور خود ہماری حکومت

بھی اسے تسلیم کرتی ہے، تو قرض کی کل رقم پاکستانی روپے میں:
۳۰ ارب ۲۷ کروڑ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ بنتی ہے۔

قرض دینے والے ممالک

قرض دینے والے ممالک میں بلجیم، کینیڈا، فرانس جرمنی، اٹلی، جاپان، نیدرلینڈ، برطانیہ، امریکہ چین، چیکوسلواکیا، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، روس، یوگوسلاویہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انٹرنیشنل بنک اور انٹرنیشنل ترقیاتی ایجنسی بھی شامل ہیں۔

سود کی ادائیگی

کل سود جو ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء تک ادا ہو چکا ہے ۱۹۸ ملین ڈالر ہے۔

۱۹۸ ملین ڈالر = ۹۵ کروڑ ۴ لاکھ روپے۔

(کارروائی قومی اسمبلی مؤرخہ ۴ جون ۱۹۶۸ء جواباً ازجام صادق علی)

اور بونس واچر کے حساب سے ۱۵۶ کروڑ ۸۱ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ ہے۔
اس سود میں ہر سال جس طرح اضافہ ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ:

۶۵-۱۹۶۴ء میں سود کی رقم ۲۶ کروڑ ۶۲ لاکھ تھی۔
۶۶-۱۹۶۵ء میں سود کی رقم ۳۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ہو گئی۔
اور ۶۷-۱۹۶۶ء میں سود کی رقم ۴۵ کروڑ ۷ ۵ لاکھ روپے ہو گئی۔

(کارروائی قومی اسمبلی مؤرخہ ۴ جون ۶۸ء)

باب دوم

غیر ملکی سرمایہ کاری

موجودہ دور میں ترقیاتی پروگرام میں جن چیزوں کو ترقی کے لیے انتہائی ضروری سمجھا جاتا ہے ان میں غیر ملکی کمپنیوں کو، جو ملک میں سرمایہ لگا کر بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرتی ہیں، بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے حکومتیں غیر ملکی سرمایہ کو دعوت دیتی ہیں۔ انھیں یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ ان کے کارخانوں کو قومی ملکیت نہیں قرار دیا جائے گا۔ اِن یقین دہانیوں ہی کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ دار کروڑوں روپے پسماندہ ممالک میں خرچ کر کے بہت بڑے بڑے کارخانے بناتے ہیں اور اس طرح جو کام اپنے ملک کے سرمایہ دار یا خود حکومت نہیں کر سکتی وہ بڑے بڑے کام غیر ملکی کمپنیاں کرتی ہیں۔ اس سے غیر ملکی کمپنیاں بہت فائدہ اٹھاتی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ملک کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے بشرطیکہ وہ کام اس نوعیت کے ہوں کہ عوامی مفاد کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ مثال کے طور پر غیر ملکی کمپنیوں نے متحدہ ہندوستان میں ریلیں چلائیں، پہاڑ کاٹ کر سرنگیں بنائیں اور ریل کی پٹڑی بچھائی۔ اسی طرح نہریں کھودی گئیں۔ اب بھی اگر کوئی کمپنی یہاں فولاد کا کارخانہ قائم کرے، موٹریں بنانے کی فیکٹری قائم کرے یا کیمیکلز تیار کرنے کا انتظام کرے جو ہم باہر سے منگواتے ہیں تو یہ سرمایہ کاری یقیناً ملک کے

لیے مفید ہوگی اگرچہ کچھ دُوسرے پہلو ایسے بھی ہیں جو اس میں قابلِ اعتراض ہیں۔

غیر ملکی سرمایہ کو دعوت حکومت پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاری کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور پوری پوری جدّ و جہد کر رہی ہے کہ دُوسرے ممالک کے سرمایہ دار پاکستان میں سرمایہ لگائیں اس لیے حکومت نے سرمایہ کاری کو ترقی دینے کا ایک ادارہ نیویارک (امریکہ) میں جاری کر رکھا ہے اور ڈسلڈورف، ٹوکیو، اور لندن میں بھی ایسے ہی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ اِن اداروں کا مقصد یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے سرمایہ داروں کو ان منافع کمانے کے مواقع سے آگاہ کیا جائے جو پاکستان میں پائے جاتے ہیں اور انھیں ان مراعات سے واقف کیا جائے جو حکومتِ پاکستان انھیں مہیا کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں سرمایہ لگانے والی ٹیموں کو پاکستان میں آنے کی دعوت بھی دی جاتی ہے اور معاہدات کی شرائط کے متعلق بھی ان سے گفتگو کی جاتی ہے اور ہر وُہ رعایت جو وُہ طلب کریں عام طور پر دی جاتی ہے۔

مراعات مراعات یوں تو بے شمار ہیں لیکن بڑی بڑی چند شرطیں درج ذیل ہیں:

(۱) پرائیویٹ کاروبار میں انھیں خصوصی سہولتیں حاصل ہوں گی۔

۲۔ ان کا کاروبار کبھی قومی ملکیت میں نہیں لیا جائے گا۔

۳۔ ان کمپنیوں کو اپنا سرمایہ واپس لے جانے کی اجازت ہوگی نیز وُہ سرمایہ جو منافع خوری کے ذریعے یہاں پیدا کر لیا جائے گا اسے بھی واپس لے جانے کی اجازت ہوگی۔

۴۔ منافع کی رقوم کے باہر بھیجنے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

۵۔ ۲ سال سے ۶ سال تک ٹیکس معاف ہو گا۔

۶۔ غیر ملکی کاریگروں سے، جو کمپنیوں کے پاس ملازم ہوں گے ۳ سال تک انکم ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔

۷۔ غیر ملکی مزدور اپنے گھروں کو رقم بھیج سکیں گے۔

۸۔ صنعتی سرمایہ کاری کے اداروں سے انھیں لمبے عرصے کے لیے قرضے مل سکیں گے۔

۹۔ بعض صنعتوں کو ٹیرف کی سہولتیں بھی میّسر ہوں گی۔

۱۰۔ خام مال اور پرُزے درآمد کرنے کی انھیں خصوصی سہولت دی جائے گی۔

۱۱۔ امریکہ کے سرمایہ کاروں کو نقصان سے تحفّظ کی خصوصی گارنٹی بھی دی جائے گی۔

۱۲۔ ان کمپنیوں کی روزمرّہ کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے ایک خصوصی ادارہ قائم کیا جائے گا جو براہِ راست اُوپر کی سطح پر گفت وشنید کا ذریعہ ہے اور فوراً مطالبات پُورے کر دیے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اَور بھی مختلف طریقوں سے ان پر نوازشات کی بارش کی جاتی ہے اور حوصلہ افزائی کے لیے انھیں من مانے منافع حاصل کرنے کی اجازت ہے لیکن اس تمام جدّ و جہد اور فیاضانہ برتاؤ بلکہ خوشامد کے باوجود جو غیر ملکی سرمایہ پاکستان میں لگایا گیا ہے اس کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں۔

کُل سرمایہ کاری

سال	کل رقم جو مختلف کمپنیوں نے لگائی
۱۹۵۷ء	۸ کروڑ ۷۹ لاکھ روپیہ
۱۹۵۸ء	۶ کروڑ ۷۵ لاکھ روپیہ
۱۹۵۹ء	۸ کروڑ ۴۶ لاکھ روپیہ
۱۹۶۰ء	۷ کروڑ ۶۶ لاکھ روپیہ
۱۹۶۱ء	۹ کروڑ ۶ لاکھ روپیہ
۱۹۶۲ء	۷ کروڑ ۶ لاکھ روپیہ
۱۹۶۳ء	۷ کروڑ ۷۶ لاکھ روپیہ
۱۹۶۴ء	۱۳ کروڑ ۲۴ لاکھ روپیہ

۳۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء تک کل سرمایہ ۸۳ کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ تھا اور انھوں نے جو منافع کمایا ہے اس کے متعلق معلومات مہیّا کرنے سے حکومت نے بھی معذوری کا اظہار کر دیا ہے۔

بھارت کی شرائطِ غیر ملکی سرمایہ کاری

ہمارے پڑوسی مُلک بھارت نے جن شرائط پر غیر مُلکی سرمایہ کاری کو دعوت دے رکھی ہے ان کا مطالعہ بھی دِلچسپی کا باعث ہوگا۔ وُہ شرائط درج ذیل ہیں:

ا۔ واقعی کوئی صنعتی منصوبہ ہو جس کے تحت صنعتی ادارہ کچھ چیزیں تیار کرے صرف تجارت اور مال کی تقسیم کا کاروبار نہ ہو۔

۲۔ اس سرمایہ کاری کا میدان ایسا ہو کہ اس میں ملکی سرمایہ کاری نہ ہو یا ہو تو بہت کم ہو یا معیار کے اعتبار سے کم درجے کی ہو۔

۳۔ زرِ مبادلہ کی پوزیشن کو بہتر بنانے، برآمد کو ترقی دینے یا درآمد میں کمی کرنے کا ذریعہ ہو۔

۴۔ پیداوار میں اضافہ کا باعث ہو۔

۵۔ بھارتی لوگوں کو اعلیٰ فنّی اور انتظامی معاملات میں تربیت دے۔

۶۔ ہر مرحلہ پر ملکی سرمایہ کو دعوت دے۔

(اکنامک ڈویلپمنٹ صفحہ ۲۷۱ از کنڈل برگر)

غیر ملکی کمپنیوں کے منافع

سٹیٹ بنک کے سروے کے مطابق ایسی کمپنیاں جو پاکستان سے باہر قائم ہوئی ہیں اور پاکستان میں کام کر رہی ہیں ان کی کل تعداد ۲۳۲ ہے اور ۳۱ دسمبر ۶۵ء تک کل سرمایہ جو پاکستان میں لگایا گیا ہے وہ ۸۳ کروڑ ۸۲ لاکھ ہے۔ ان کمپنیوں نے جو منافع کمایا ہے اس کا صحیح علم حاصل کر لینا تو ممکن نہیں ہے لیکن سٹیٹ بنک نے جو رقوم منافع کے طور پر زرِ مبادلہ کی صورت میں باہر بھیجی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۹۵۷-۵۸	۲ کروڑ ۴۴ لاکھ ۹۰ ہزار روپے
۱۹۵۸-۵۹	۲ کروڑ ۵۹ لاکھ ۴۰ ہزار روپے
۱۹۵۹-۶۰	۳ کروڑ ۹۷ لاکھ ۲۰ ہزار روپے
۱۹۶۰-۶۱	۳ کروڑ ۶۱ لاکھ ۸۰ ہزار روپے

1961-۶۲	۳ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے
1962-۶۳	۴ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے
1963-۶۴	۵ کروڑ ۳۳ لاکھ ۶۰ ہزار روپے
1964-۶۵	۳ کروڑ ۵۳ لاکھ ۲۰ ہزار روپے
1965-۶۶	۲ کروڑ ۷۴ لاکھ ۶۰ ہزار روپے
1966-۶۷	۴ کروڑ ۴ لاکھ ۴ ہزار روپے

۲۳۲ کمپنیوں کے صرف ۸۲ کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ سرمایہ لگانے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اوسطاً ہر کمپنی نے ۳۶-۳۷ لاکھ روپیہ سرمایہ لگایا ہے اور اتنے سرمائے سے کوئی بڑا کام، بڑا کارخانہ قائم نہیں ہو سکتا جس سے پاکستان کو کوئی فائدہ پہنچ سکے بلکہ کوکاکولا کی قسم کی فیکٹریاں بنائی گئی ہیں جو یہاں سے پانی لے کر یہاں ہی بیچ دیتی ہیں اور بے تحاشا منافع کماتی ہیں۔ باہر سے آئے چھوٹے کاریگروں اور مینجروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتی ہیں اور زرِمبادلہ کی شکل میں وہ فیملی الاؤنس باہر بھیج دیتے ہیں۔ پھر زرِمبادلہ میں جو منافع بھیجا جاتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۷ میں ۸ کروڑ ۹۷ لاکھ سرمایہ لگایا گیا تھا اور ۲ کروڑ ۴۴ لاکھ ۹۰ ہزار منافع زرِمبادلہ میں باہر بھیجا گیا۔ اس طرح ۲۷ فیصدی رقم واپس چلی گئی اور دوسرے طریقوں سے جو رقم گئی اس کا بھی حساب لگایا جائے تو اصل رقم کا پچاس فیصدی ایک ہی سال میں واپس چلا جاتا ہے۔

۱۔ اکنامک سروے آف پاکستان ۶۷-۶۶ صفحہ ۳۰-۳۱

۲۔ کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۸ مئی ۶۸ء سوال نمبر ۱۵ کے جوابات از الطاف حسین وزیر صنعت

پی ایل ۴۸۰ اور سرمایہ کاری

تمام حالاتِ کار کا اگر گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا غیر ملکی سرمایہ لگایا بھی گیا ہے؟ کیونکہ امریکہ سے پی ایل ۴۸۰ کے تحت فالتو زرعی پیداوار جو پاکستان قرض کے طور پر حاصل کرتا ہے اس میں سے بڑی بڑی رقمیں بعض کمپنیوں کو مہیا کر دی جاتی ہیں اور وہ یہاں کاروبار شروع کر دیتی ہیں۔ ایسی کمپنیوں میں سے کچھ کے نام اور جو رقم اسے مہیا کی گئی درج ذیل ہیں:

۱۔ وارنر لیمبرٹ' دوا سازی کی کمپنی	۱۰ لاکھ روپیہ	۲۳-۱۲-۵۸
۲۔ فرز ایسٹرن کارپوریشن	۲۰ لاکھ "	۲۶-۹-۵۹
۳۔ لیڈرلے لیبارٹریز' دوا سازی کی کمپنی	۱۵ لاکھ "	۳-۱۱-۵۹
۴۔ ایبٹ لیبارٹریز' " " "	۲۰ لاکھ "	۵-۱۱-۵۹
۵۔ ویتھ لیبارٹریز' " " "	۱۸ لاکھ "	۲۱-۱-۶۱
۶۔ پارک ڈیوس' " " "	۲۰ لاکھ ۵ ہزار	۲۶-۶-۶۱
۷۔ پاکستان سروسز لمیٹڈ' ہوٹل بنانے کے لیے کراچی'	۴۷ لاکھ' ۴۳ ہزار سات سو	۳۰-۹-۶۱
۸۔ " " " " لاہور	۳۹ لاکھ ۳ ہزار	۵-۱۰-۶۳
۹۔ " " " " راولپنڈی	۳۴ لاکھ ۹۴ ہزار	۱۰-۱۱-۶۴

۱۰۔ جنرل ٹائر اینڈ ربر کمپنی، ٹائر ٹیوب بنانے والے ۱۷ لاکھ ۱۳ ہزار
۲۳ - ۱۲ - ۶۱

۱۱۔ سنگر سیونگ مشین، مشینوں کی تقسیم کے لیے ۵۰ لاکھ
۲ - ۶ - ۶۲

۱۲۔ سنگر سیونگ مشین، مشینوں کی تقسیم کے لیے، ۵۰ لاکھ ۲۵-۳-۶۵

۱۳۔ سنگر انڈسٹریز، " " ، ۲۲ لاکھ ۵۰ ہزار
۱۶ - ۶ - ۶۵

۱۴۔ پاکستان امریکن لبرٹی ٹرمینل سٹوریج ۶ لاکھ ۶۷ ہزار
۱۹ - ۱۲ - ۶۲

۱۵۔ مرک اینڈ کمپنی، دواسازی، ۱۵ لاکھ ۴ - ۵ - ۶۳

۱۶۔ فلپس ڈاج ۱۷ لاکھ ۸۰ ہزار ۸ - ۶ - ۶۳

۱۷۔ سی فوڈ فریزر ۵ لاکھ ۲۷ - ۱۱ - ۶۳

۱۸۔ کارٹر والیس، دواسازی ۱۰ لاکھ ۱۶ - ۱۲ - ۶۳

۱۹۔ شیزان مشروب تیار کرنا ۲۳ لاکھ ۷۵ ہزار
۲۵ - ۹ - ۶۴

۲۰۔ رفحان میز پروڈکٹس ۵۰ لاکھ ۷ - ۴ - ۶۵

۲۱۔ سن شائن فارمز، ڈیری فارم ۶ لاکھ ۲۱ - ۱۲ - ۶۵

۲۲۔ جانسن اینڈ جانسن، دواسازی ۸ لاکھ ۲۷ - ۱ - ۶۶

۲۳۔ جانسن اینڈ جانسن، " ۱۰ لاکھ ۳ - ۶ - ۶۷

۲۴- سیبرل پاک برتھ کنٹرول ادویات ۸ لاکھ ۱۵-۳-۶۷

۲۵- پاکستان فیبرک کمپنی جیوٹ کے کور بنانا ۲۰ لاکھ ۱۱-۱-۶۱

۲۶- 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰ لاکھ ۲-۶-۶۲

۲۷- 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۳ لاکھ ۱۰-۱۱-۶۴

۲۸- پاکستان سروسز برائے تعمیر ہوٹل ڈھاکہ ، ۴۴ لاکھ ۷۷ ہزار

۲۵-۳-۶۳

۲۹- انٹرنیشنل ہوٹلز کارپوریشن

برائے تعمیر ہوٹل ڈھاکہ ۶۴ لاکھ ۶۶ ہزار ۶۶ روپے ۲۳-۶-۶۰

۳۰- 〃 〃 〃 ۳۵ لاکھ ۲۶-۷-۶۳

نتائج

یہ کمپنیاں کچھ خالص امریکن ہیں۔ بعض نے پاکستانی حصہ داران کو ساتھ لے لیا ہے اور کوئی بڑا کارخانہ یا فولاد کا کارخانہ تو کجا محض ہوٹلوں کا کاروبار شروع کیا ہے۔ کچھ مشروب تیار کیے ہیں جنہوں نے مُلک کی ہزارہا سوڈا واٹر فیکٹریوں کو ختم کر دیا ہے یا معمولی قسم کی ادویات بنا کر لوٹ مار مچا رکھی ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مُلکی سرمایہ کاری کے فوائد میں سے تو ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن نقصانات کا سلسلہ دراز بھی ہے اور تشویش انگیز بھی۔

کاروائی قومی اسمبلی مورخہ ۳۰ مئی ۶۸ء - پارلیمانی سیکرٹری برائے اقتصادی امور

باب سوم

ترقیاتی منصوبے

منصوبہ بندی کمیشن کے تجزیہ کے مطابق غیر ملکی قرضوں کا ۷۳ فیصد حصہ مختلف ترقیاتی منصوبوں (پروجیکٹس) پر خرچ ہوتا ہے اور ۲۷ فیصد اشیاء کی درآمد پر۔ چونکہ قرضے کا قریباً ۳/۴ حصہ اور ملک کے اپنے ذرائع کا بڑا حصہ مختلف منصوبوں پہ خرچ ہو رہا ہے اس لیے ان منصوبوں کی صورتِ حال یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

غیر ملکی مشیر

ہر منصوبہ کے لیے غیر ملکی مشیر قرض کے ساتھ ہی آتے ہیں اور منصوبوں کی تکمیل میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ان مشیر حضرات کو جو رقم خدمات کے عوض دی جاتی ہے وہ بعض اوقات اتنی ہوتی ہے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پارلیمانی سیکرٹری برائے آب پاشی و برقیات مغربی پاکستان جناب امتیاز احمد گل نے ایک سوال کے جواب میں صوبائی اسمبلی کو بتایا کہ واپڈا کا محکمہ اپنے آٹھ غیر ملکی مشیروں کو ساڑھے تین کروڑ روپیہ سالانہ مشاہرہ ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں چار غیر ملکی کمپنیوں کو مشوروں کی فیس الگ ادا کرتا ہے (ملاحظہ ہو روزنامہ کوہستان مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۳ء)

شہر لاہور کی واٹر سپلائی اور سیوریج سکیم کی موزونیت کی رپورٹ تیار کرنے کے

لیے ۱۳ لاکھ روپیہ ادا کیا گیا۔ انجنیئرنگ کے کام میں مشورہ دینے والی فرم ۲۴ لاکھ روپے اور انتظامی امور کے متعلق مشورہ دینے کے لیے ایک فرم ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ وصول کرے گی۔ (یہ کام اب شروع ہو رہا ہے اور نہ جانے کب تک چلے)۔

غیر ملکی فرموں کے ٹھیکے

جن غیر ملکی فرموں کو (بڑی حد تک مجبوراً) ٹھیکے دیے جاتے ہیں ان کی کارکردگی بھی اطمینان بخش نہیں ہوتی۔ وہ اکثر کام پاکستانی چھوٹے ٹھیکیداروں سے کراتے ہیں اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ جس کام کا سو روپیہ وہ وصول کرتے ہیں اس کام کو ۱۵۔۲۰ روپے ٹھیکہ دے کر کراتے ہیں۔

ملتان پاور ہاؤس، غیر ملکی ٹھیکیداروں کی کارکردگی

ملتان پاور ہاؤس کی خرابی غیر دانشمندانہ منصوبہ بندی، غلط ڈیزائن، غلط تنصیب اور غلط انتظام کا نتیجہ تھی۔ پاکستان الیکٹریکل اور مکینکل انجینیرز کی ایسوسی ایشن نے گہرے مطالعہ کے بعد اس رائے کا اظہار کیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ملتان میں تھرمل سٹیشن قائم کرنے کا یہ اوّلین تجربہ تھا اور اس کا ڈیزائن تیار کرنے اور نصب کرنے کا کام ایک ایسی اطالوی فرم کو سونپا گیا جو اس سلسلے میں کوئی تجربہ نہ رکھتی تھی بلکہ کیمیاوی اشیا تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ نصب کرنے کے بالکل ابتدائی دور میں ایک بڑی شافٹ کو نقصان پہنچ گیا اور اسے مرمّت کے لیے ہوائی جہاز سے جرمنی بھیجنا پڑا۔ یہی شافٹ دوبارہ خراب ہو گئی اور پھر ہوائی جہاز سے اسے جرمنی روانہ کیا گیا۔ جب مشینوں نے کام شروع کیا تو ایک مشین میں

خرابی پیدا ہوگئی جس سے تمام مشینری کو نقصان پہنچا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈیزائن بھی غلط تھا اور جو سامان استعمال کیا گیا وہ بھی ناقص تھا۔ کام کا معیار بھی بہت پست تھا۔ اس اطالوی فرم نے جو سامان دوسرے ملکوں کو دیا ہے وہ بھی ہر جگہ ناقص ثابت ہوا ہے (ملاحظہ ہو پاکستان ٹائمز مورخہ ۶ جنوری ۶۸ء)

ترقیاتی منصوبوں کے لیے تخمینے

غیر ملکی مشیروں اور ٹھیکیداروں کے بعد ایک اہم مسئلہ تخمینوں کا ہے جو ابتداءً بڑے غور و فکر کے بعد بڑی کفایت شعاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیار کیے جاتے ہیں اور ان ابتدائی تخمینوں کو دیکھتے ہوئے ترقیاتی منصوبوں کی منظوری دے دی جاتی ہے لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے یہ تخمینے بدلنا اور پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کئی کروڑ روپیہ صرف کرنے کے بعد انہیں نامکمل چھوڑنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور تکمیل کروڑوں روپیہ مزید مانگتی ہے۔ ابتداءً تکمیل کی مدت بھی بہت معقول نظر آتی ہے لیکن جب منصوبہ شروع ہو جائے تو پھر منصوبہ در منصوبہ اور نظر ثانی کا ایسا چکر چلتا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

منصوبوں کے متوقع نتائج

منصوبہ پیش کرتے ہوئے جو متوقع نتائج اور فوائد گنوائے جاتے ہیں وہ بھی کام شروع ہو جانے کے بعد محض سراب ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اکثر منصوبے غیر منافع بخش ثابت ہوتے ہیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے بعض اہم منصوبوں کا جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے ترقیاتی منصوبے

تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دوسرے سال میں مشرقی پاکستان کی ترقیات کا کیا حال ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سکینڈ انبویل ڈائجسٹ لکھتا ہے۔

(ملاحظہ ہو پاکستان آبزرور ۲۰ ستمبر ۶۸ء)

"زیر تبصرہ سال میں جو شدید خامی محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ منصوبوں پر عمل میں کوئی باقاعدگی نہیں، سرمایہ کے خرچ اور حاصل شدہ نتائج میں بہت زیادہ فرق ہے اور زیر تکمیل یا مکمل شدہ پروجیکٹ سے متوقع فوائد اور حاصل ہونے والے فوائد میں کوئی نسبت نہیں تکمیل کی رفتار کار اور اخراجات خصوصاً پانی اور بجلی سے متعلق منصوبے سخت باعثِ تشویش بنے ہوئے ہیں مشرقی پاکستان میں واٹر پمپوں کے ذریعے آبپاشی کے انتظام کو کسی طرح بھی اطمینان بخش قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ آبپاشی کی سہولت صرف ۱۵ ہزار ایکڑ رقبے کے لیے حاصل ہو سکی ہے جب کہ انتظام ایک لاکھ ایکڑ کے لیے کیا گیا تھا۔ بہت سے پمپ ویسے ہی ضائع ہو گئے اور باقی کی مرمت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔"

بہت سے منصوبے صحیح مدت کے اندر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے اور ان پر لاگت اصل تخمینہ سے بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ یہ رجحان پرورش پا رہا ہے کہ

پروجیکٹ کے ساتھ ضمنی قسم کی عمارتوں پر زیادہ خرچ کر دیا جائے۔

" ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ پراجیکٹ کی اصل ضروریات، مشینری، اوزار، کارخانے پر صرف ۲۵ سے ۳۰ فیصدی تک خرچ کیا گیا ہے اور انتظامی دفاتر، رہائشی بنگلوں پر ۵۰ فیصدی سے بھی زیادہ خرچ کیا گیا ہے۔"

ڈائجسٹ نے مختلف سکیموں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

۱۔ مارچ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۲ واٹر پمپ بیکار پڑے ہیں اور ان کی مرمت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا ــــــ دوسرے منصوبوں کی صورت حال یہ ہے:

۱۔ تیرہ چپا گانگ پراجیکٹ (چاندپور سکیم)

اس سکیم کے تحت ایک لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ اراضی کو سیراب کرنا اور ۸۶ ہزار ۷ سو ایکڑ اراضی کو سیلاب سے محفوظ کرنا مقصود تھا۔ اس کا ابتدائی تخمینہ ۵۴۸ لاکھ ۷ ہزار روپے تھا اور اسے ۱۹۶۷ء میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا، لیکن اس کا کام مئی ۶۷ء ہی میں شروع ہو سکا اور نظر ثانی شدہ تخمینہ ۱۱۲۷ لاکھ ہے جو اصل کام اور متوقع نتائج کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ ہے۔

۲۔ ایسٹ پاکستان ٹولز پروجیکٹ

اس منصوبے کا آغاز مئی ۱۹۶۱ء میں کیا گیا اور ۶۵ء میں اسے بالکل مکمل ہو جانا چاہیے تھا لیکن اب ۱۹۶۸ء میں بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ اس پر ۳۲۹ لاکھ ۶۲ ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے اور

صرف ۳۸ فیصدی کام ہُوا ہے ۔ ۶۲ فیصدی کام ابھی باقی ہے اخراجات کے تناسب سے جو کام ہُوا ہے اور جتنی مدّت صرف ہُوئی ہے' بالکل مایوس کُن ہے ۔

(۳) ہائیڈرولک ریسرچ لیبارٹریز

اس منصوبے کی ابتدا دسمبر ۶۰ء میں ہُوئی تھی اور ۶۶ - ۶۵ء میں اسے مکمل ہو جانا چاہیے تھا ۔ اصل تخمینہ ۳۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کا تھا ۔ اب تک ۴۷ لاکھ ۱۶ ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے ۔ کام کسی بھی منزل میں نہیں ہے ۔ نظرثانی شدہ تخمینہ ۱۹۵ لاکھ ۴۲ ہزار روپے کا اب تیار کیا گیا ہے ۔

(۴) گنداریہ اشمتی پروجیکٹ، بوگرا ڈسٹرکٹ

اس پروجیکٹ کو بہتر بنانے کا کام مکمل ہو چکا ہے لیکن تیسرے ریگولیٹر کو بنانے کی اسکیم ختم کر دی گئی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے لیکن مارچ ۱۹۶۲ء سے اب تک اس پر ۳۵ لاکھ ۴۸ ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے' اس اسکیم پر تمام اخراجات محض فضول ہوئے ہیں کیونکہ دریائے برہم پتر پر بند تعمیر ہو جانے سے گنداریہ اشمتی میں پانی بہت ہی کم ہو چکا ہے ۔

(۵) فینی سب ڈویژن سیلاب اسکیم

سیلاب کی روک تھام کی اس اسکیم پر اصل اخراجات کا تخمینہ ۳۹ لاکھ ۷۰ ہزار روپے کا تھا اور نظرثانی شدہ ۹۹ لاکھ ۲۰ ہزار روپے کا (دوگنے سے کہیں زیادہ قریباً تین گنا) ۔ جنوری ۱۹۵۷ء میں کام کی ابتدا ہو چکی تھی اور اب

تک ۸۰ لاکھ ۴۴ ہزار روپے صرف ہو چکے ہیں اور نئے تخمینے کے مطابق جو سکیم بنائی گئی ہے اس کا صرف ۷۰ فیصدی کام ہو سکا ہے۔

(۶) ڈھاکہ نرائن گنج آبپاشی سکیم

دریائے گومتی کا یہ پروجیکٹ ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا۔

اس سکیم کا اصل تخمینہ ۱۳۰ لاکھ روپے کا تھا۔ نظر ثانی شدہ تخمینہ ۲۰۸ لاکھ ۳۰ ہزار کا ہے۔

(۷) برہم پتر ٹرانسمشن اینڈ ڈسٹری بیوشن سکیم

اس سکیم کی حالت یہ ہے کہ اس کی ابتدا جولائی ۶۲ء میں ہوئی تھی اور جون ۶۷ء تک اس پر ۱۴۲۷ لاکھ ۲۷ ہزار روپیہ صرف ہو چکا تھا، جب کہ اس کا اصل تخمینہ ۱۰۹۲ لاکھ روپے کا تھا۔

چٹاگانگ، نواکھلی، باقر گنج اور کھلنا میں بند باندھنے کی سکیموں پر نظر ثانی ہو چکی ہے۔ اگرچہ اخراجات کا اندازہ یہ ہے کہ تخمینوں کی ۵۵ فیصدی رقم خرچ ہو چکی ہے، لیکن کام ۴۰ فیصدی سے زیادہ نہیں ہو سکا۔

(۸) گنگا، کوباڈک، کشتیا یونٹ

یہ کام اچھی رفتار سے ہوا ہے لیکن اس کے اخراجات ۷۹۴۴ لاکھ ۸۷ ہزار ہیں جب کہ اصل تخمینہ صرف ۱۵۷۸ لاکھ کا تھا۔

بجلی کے منصوبوں کی صورت یہ ہے کہ ڈھاکہ الیکٹرک سپلائی، الیکٹریکل اور میکینکل ورکشاپ، ٹسٹ اور ریسرچ لیبارٹری، سدھیر گنج ایشر دی، سدھیر گنج، آشوگنج (سلہٹ) گو لپاڑہ سٹیم سٹیشن وغیرہ کئی منصوبے پایۂ تکمیل کو مقررہ

مدت کے اندر نہیں پہنچ سکے۔

مغربی پاکستان کے ترقیاتی منصوبے

راول ڈیم کا منصوبہ

اس منصوبے کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ اسلام آباد دارالحکومت کے پاس ہے۔

اس منصوبے کی تکمیل پر ۲۱۱ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

اس کی متوقع سالانہ آمدنی ۲۱ لاکھ ۸۸ ہزار روپیہ ہے۔

اس کے متوقع سالانہ اخراجات ۱۹ لاکھ ۸۱ ہزار روپے ہیں۔

متوقع سالانہ منافع ۲ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ ہے۔

اصل رقم پر سالانہ سود

۶ فیصدی کے حساب سے ۱۲ لاکھ ۶۶ ہزار روپیہ ہوگا۔

(کارروائی صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان، اکتوبر ۶۷ء)

کھادر ٹیوب ویل سکیم

واپڈا نے چند برس پیشتر لالیاں (ضلع سرگودھا) کے قریب یہ سکیم شروع کی تھی اور اس کے تحت کُل ۲۱۳ ٹیوب ویل نصب کیے گئے تھے۔ ہر ایک ٹیوب ویل کی تنصیب پر پونے دو لاکھ روپے کی لاگت آئی تھی جس میں غیر ملکی فنی مشیروں کا معاوضہ بھی شامل ہے۔ اس سکیم کے تحت نصب شدہ ۴۵ ٹیوب ویل پہلے ناکارہ ہو گئے تھے، مزید ۳۵ ٹیوب ویلوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ کُل بیکار

ہونے والے ٹیوب ویلوں کی تعداد ۸۹ ہو چکی ہے اور اس سے ۱۵۴ لاکھ روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔ ٹیوب ویلوں کے بند ہونے سے فصلوں اور کاشتکاروں کو جو نقصان ہوا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس سکیم کی ناکامی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ زیر زمین پانی میں نمکیات کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ خبر یہ ہے کہ ایک پاکستانی انجنیئر نے واپڈا کے حکام کو اس سکیم کے نفاذ سے پہلے ان خطرات سے آگاہ کیا تھا، لیکن اس وقت اس انجنیئر کو "غیر ملکی ماہرین کے کام میں مداخلت" کے جرم میں کسی جواب طلبی یا اظہارِ وجوہ کا نوٹس دیئے بغیر علیحدہ کر دیا گیا۔ (آخری اطلاعات کے مطابق ۱۱۳ ٹیوب ویل خراب ہو چکے ہیں اور نقصان ۲۰۰ لاکھ کا ہو چکا ہے)۔

سکارپ سکیم اس سکیم کے تحت بھی ٹیوب ویل لگائے گئے تھے اور کاشت کاروں سے آبیانہ وصول کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سکیم کے کچھ دلچسپ پہلو بھی ہیں۔ تحصیل حافظ آباد کے ایک گاؤں کے لوگ گذشتہ چھ برس سے ایک ٹیوب ویل کے پانی کی قیمت ادا کر رہے ہیں جو اب تک لگایا نہیں گیا۔ لوگ آبیانہ کے طور پر اب تک نوّے ہزار روپیہ ادا کر چکے ہیں۔ یہ گاؤں ۱۹۶۱ء میں سکارپ سکیم میں شامل کیا گیا تھا اور اس وقت ٹیوب ویل نصب کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ متعلقہ حکام نے اس تجویز کے تحت آبیانہ تو وصول کرنا شروع کر دیا لیکن ٹیوب ویل نصب نہ ہو سکا۔ اور اب غالباً لگانے کا کوئی پروگرام ہی نہیں ہے لیکن آبیانہ وصول کیا جا رہا ہے۔ یہ بدانتظامی کی ایک بدترین

مثال ہے۔ (امروز ۷، اپریل ۶۶۸)۔

گمل زام سکیم سرکاری پارٹی کے ایک ممبر صوبائی اسمبلی جناب میر بادشاہ خاں صاحب نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ گمل زام سکیم پر کام جاری رکھا جائے کیونکہ اس سے ہزاروں ایکڑ اراضی زیر کاشت آجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ علاقے کی تمام سرکاری زمین کاشت کاروں کو آسان قسطوں پر دے دی جائے اور یہ پابندی عائد کی جائے کہ غیر ضلع کے لوگ یہاں پر زمینیں نہ خرید سکیں۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے اضلاع کے لوگ اب تک ہزاروں ایکڑ اراضی خرید کر یہاں کے غریب لوگوں کو حق ملکیت سے محروم کر چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ گمل زام کا کام واپڈا کی نگرانی میں نہ کیا جائے بلکہ ٹھیکہ کسی غیر ملکی فرم کو دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ واپڈا اب تک اس پر ساڑھے چار کروڑ روپیہ خرچ کر چکا ہے لیکن اس رقم میں سے صرف پچاس ہزار جائز خرچ ہوئے اور باقی روپیہ اہل کار ہضم کر چکے ہیں۔ (امروز ۱۵، جولائی ۶۶۵)۔

میانوالی ہائیڈل پروجیکٹ اس منصوبے کا آغاز ۱۹۵۰ء جنوری میں ہوا اور ابتدائی تخمینہ ۲۱۳۷ لاکھ ۷ ہزار کا تیار کیا گیا۔ ۵۴ء تک اس پر ۴۴ لاکھ ۸۱ ہزار ۸۹۷ روپے صرف ہوئے اور منصوبہ اس بنا پر ختم کر دیا گیا کہ یہ پیداواری نہیں تھا اور غیر ملکی امداد ملنے کی توقع نہیں تھی۔ (رپورٹ پبلک اکاونٹس کمیٹی مطبوعہ گزٹ (غیر معمولی) یکم مئی ۶۸ء صفحہ ۱۷۱۸)

خیرپور تمباکو فیکٹری یہ منصوبہ ۱۹۵۴ء میں بنایا گیا اور اس پر ۴۰ لاکھ ۳۲ ہزار ۹۵۵ روپے صرف ہوئے۔ اس کا مقصد

یہ تھا کہ تمباکو خشک کر کے دوسرے ممالک کو بھیجا جائے۔ چونکہ تمباکو ضلع مردان اور کیمبل پور میں پیدا ہوتا ہے اس لیے یہ منصوبہ بیکار ثابت ہُوا اور ۱۹۵۶ء میں ختم کر دیا گیا۔ (رپورٹ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، مورخہ ۱۴ر دسمبر ۶۶ء صفحہ ۳۴۰۵)

۵ روڈ ٹرانسپورٹ بورڈ

روڈ ٹرانسپورٹ بورڈ پر جو رقم صرف ہوئی ہے، اور ان مصارف سے جو منافع ہُوا وہ درج ذیل ہے:

سال	سرمایہ جو لگایا گیا	منافع	فیصدی شرح منافع
۱۹۵۳-۵۴ء	۱۹۳ لاکھ ۴۲ ہزار ستر	۳۳ لاکھ ۴۰ ہزار ۵۰۵	۱۶،۷۷
۱۹۵۴-۵۵ء	۲۴۸ لاکھ ۹۳ ہزار ۵۴۰	۳۵ لاکھ ۳۶ ہزار ۳۲۹	۱۴،۲۱
۱۹۵۵-۵۶ء	۳۱۳ لاکھ ۴۷ ہزار ۸۰۴	۳۳ لاکھ ۹۴ ہزار ۳۲۹	۱۱،۱۳
۱۹۵۶-۵۷ء	۲۴۷ لاکھ ۴۲ ہزار ۲۱۰	۱۲ لاکھ ۴۷ ہزار ۴۸۴	۲،۹۱
۱۹۵۷ء یکم اپریل تا ۱۴ر اکتوبر	۲۴۷ لاکھ ۴۲ ہزار ۲۱۰	۷ لاکھ ۹۷ ہزار ۸۸۶	۱،۸۶
۱۵ر اکتوبر ۵۷ء سے ۳۱ر مارچ ۵۸ء	۵۸۹ لاکھ ۷ ہزار ۷۰۵	۱۳ لاکھ ۲۷ ہزار ۶۰۵	۲،۲۵
۱۹۵۸-۵۹ء	"	۱۲ لاکھ ۲۳ ہزار ۲۸۰	۲،۰۵
۱۹۵۹-۶۰ء	"	ایک لاکھ ۲۸ ہزار ۸۰۱	

(اس کے بعد کے اعداد و شمار میسر نہیں آسکے) (رپورٹ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی یکم مئی

۱۹۶۸ء صفحہ ۱۶۷۰)

غور کرنے کا مقام ہے کہ جوں جوں سرمایہ بڑھتا جا رہا ہے منافع کم ہوتا جا رہا ہے۔ ۱۹۳ لاکھ سرمایہ لگانے سے آمدنی ۳۲ لاکھ سے بھی زیادہ تھی اور ۵۸۹ لاکھ صرف ہونے پر آمدنی ۱۲ لاکھ روپے ہے اور ۶۰-۱۹۵۹ء میں صرف سوا لاکھ روپیہ آمدنی ہوئی ہے۔

وائیکر ٹریکٹرز ۶۳ لاکھ ۳۰ ہزار ۳۳۵ روپے صرف کر کے ۴۰ وائیکر ٹریکٹر منگوائے گئے اور وہ کوئی کام نہ کر سکے۔ ۶۶ ہزار ۸ سو بیاسی روپے ان کی مرمت پر صرف ہوئے لیکن بعد میں تحقیقات پر معلوم ہوا کہ یہ ٹریکٹر صرف سرد ممالک میں کام کر سکتے ہیں اور پاکستان کے لیے بالکل ناموزوں ہیں۔ ان ٹریکٹرز کو منگوانے سے پہلے دو تین ٹریکٹر منگوا کر کام کر کے دیکھنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ زحمت کسی نے گوارا نہ کی اور اتنا بڑا آرڈر دے دیا گیا۔ ۶۰-۵۹ء کے حسابات میں یہ رقم قلم زد کی گئی۔ اگر درآمد کے اخراجات کرایہ، مرمت وغیرہ اندازہ کیا جائے تو کم و بیش ایک کروڑ روپیہ ضائع ہوا۔ (پبلک اکاؤنٹس کمیٹی برائے سال ۵۹-۵۸ء گزٹ غیر معمولی ۳۰ جون ۶۵ء صفحہ ۳۳۰۱)

حیدر آباد ڈرینج سکیم یہ سکیم ۱۹۵۳ء میں سابق سندھ گورنمنٹ نے منظور کی تھی اور ۱۹۶۸ء تک ۱۵ سال سے معلق چلی آ رہی ہے۔

یہ سکیم پہلے پی ڈبلیو ڈی کے انجینئروں کے دفاتر میں گھومتی رہی اور ۶۱ء میں پبلک ہیلتھ انجینئرنگ کے حوالے کر دی گئی۔ ۶۱ء میں غیر ملکی مشیر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ۶۳ء میں انہیں مقرر کیا گیا۔ ۶۵ء میں اِن مشیروں نے اپنی رپورٹ دی اور ۳۹۲ لاکھ روپے کا تخمینہ بتایا۔ پھر یہ طے ہوا کہ عالمی بنک کے پاس اس سکیم کو

بھیجا جائے تاکہ کچھ رقم مل سکے۔ پبلک فائنانس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات پر شدید اضطراب کا اظہار کیا ہے اور یہ بات صوبائی اسمبلی کے علم میں خاص طور پر لائی گئی ہے کہ ایسے منصوبے جن کا تعلق عوامی مفاد سے ہے انہیں معرضِ التوائ میں ڈال دیا جاتا ہے اور حیدرآباد جیسے شہر کو بھی ڈرینیج کی سہولتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ (پبلک اکاؤنٹس کمیٹی رپورٹ برائے سال ۶۰-۶۱، یکم مئی ۶۸، صفحہ ۱۳۶۲)

غلام محمد بیراج

اس بیراج کی ابتداء ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گئی تھی اور اس کے تخمینوں کی صورت یہ ہے۔

۱۹۴۷ء	۲۱۰۵ لاکھ روپے	تکمیل	۱۹۶۰ء
۱۹۵۱ء	۲۴۰۰ 〃		
۱۹۵۵ء	۳۵۰۲ 〃		
۱۹۵۹-۶۰ء	۴۱۰۶ 〃	تکمیل	۱۹۶۴ء
۱۹۶۳-۶۴ء	۴۵۱۶ 〃		
ڈرینیج سکیم	۱۵۰۰ لاکھ روپے	تکمیل	۱۹۶۸ء

(رپورٹ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی سال ۶۰-۶۱، یکم مئی ۶۸، صفحہ ۱۳۱۴)

۱۹۸۰ء میں صورت کیا ہو گی؟

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اوٹ کی رائے میں اگر حالات انتہائی سازگار رہیں اور بیراج سے پوری طرح فوائد حاصل ہونے لگیں تو ۱۹۷۹-۸۰ء میں صورت یہ ہو گی:

کل آمدنی جو ۱۹۸۰ء میں حاصل ہو گی = ۱۹۹ لاکھ ۸۹ ہزار ۷۰۶ روپے سالانہ

اخراجات جو اس پر آئیں گے = ۱۱۴ لاکھ ۹۸ ہزار ۴۰۰ روپے سالانہ
خالص آمدنی = ۸۴ لاکھ ۹۱ ہزار ۳۶۰ روپے سالانہ
بیراج بننے سے پہلے کی آمدنی = ۳۱ لاکھ ۴۳ ہزار روپے
بیراج کی وجہ سے خالص آمدنی = ۵۳ لاکھ ۴۸ ہزار ۳۶۰ روپے
خرچ کردہ رقم ساٹھ کروڑ روپے پر سود ۵½ فیصدی سالانہ کے حساب سے } ۳۱۵ لاکھ روپے سالانہ
نقصان سالانہ = ۲۶۲ لاکھ روپے

آمدنی کا تخمینہ اور اصل آمدنی

بیراج کی آمدنی کی موجودہ صورت حال کیا ہے اور پچھلے سالوں کے تجربات کیا رہے ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں وضاحت سے درج کئے ہیں

سال	مالیاتی جائزہ ۶۴ء کے مطابق جو آمدنی ہونا چاہیئے تھی :	مختارکاروں (تحصیلداروں) کے ریکارڈ کے مطابق جو آمدنی ہوئی :
۱۹۵۶-۵۷ء	= ۴۳ لاکھ ۴۸ ہزار روپے	۳۷ لاکھ ۱۷ ہزار ۹۸۹ روپے
۱۹۵۷-۵۸ء	= ۴۱ ″ ۵۲ ″ ″	۳۷ ″ ۲۱ ″ ۴۳۳ ″
۱۹۵۸-۵۹ء	= ۴۵ ″ ۹۶ ″ ″	۳۹ ″ ۳۰ ″ ۹۲۳ ″
۱۹۵۹-۶۰ء	= ۸۵ ″ ۶ ″ ″	۵۵ ″ ۵۱ ″ ۹۲۵ ″
۱۹۶۰-۶۱ء	= ۹۱ ″ ۱۹ ″ ″	۷۳ ″ ۲۶ ″ ۵۴۸ ″
۱۹۶۱-۶۲ء	= ۹۸ ″ ۷۷ ″ ″	۵۷ ″ ۹۲ ″ ۶۲۶ ″

۱۹۶۲-۶۳ء =	۱۲۶ لاکھ ایک ہزار روپے	۵۰ لاکھ ۲۴ ہزار ۴۲۹ روپے
۱۹۶۳-۶۴ء =	۱۳۸ لاکھ ۲۲ ہزار روپے	۵۱ ” ۹۱ ” ۳۲ ”
۱۹۶۴-۶۵ء =	۱۵۲ ” ۱۷ ” ”	۴۵ ” ۲۸ ” ۵۵۵ ”
۱۹۶۵-۶۶ء =	۱۶۶ ” ۶۰ ” ”	۴۷ ” ۵۲ ” ۷۴۲ ”
	۹۸۰ لاکھ ۳۴ ہزار	۵۰۲ لاکھ ۹۳ ہزار ۲۰۲ روپے

اس کے معنی یہ ہیں کہ کل رقم جس کا اندازہ کیا گیا تھا ۹۸۰ لاکھ ۳۴ ہزار روپیہ تھی لیکن محکمہ مال نے جو رقم مالیہ کے طور پر عائد کی وہ اس کے نصف کے قریب تھی ۵۰۲ لاکھ ۹۳ ہزار۔ لیکن اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آڈٹ کے حساب کے مطابق صرف ۱۸۱ لاکھ ۷۳ ہزار ۸۸۸ روپے وصول ہوئے۔ گویا مالیاتی تخمینہ کا صرف ۲۰ فیصدی حصہ۔

زیر کاشت رقبے میں اضافہ آمدنی میں کمی

اس کا مزید دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ زیر کاشت رقبے میں جوں جوں اضافہ ہوتا جاتا ہے آمدنی کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ

۱۹۶۱-۶۲ء میں زیر کاشت رقبہ	۹ لاکھ ۷۲ ہزار ۶۱۰ ایکڑ تھا	
۱۹۶۲-۶۳ء ” ” ” ”	۱۱ ” ۴۴ ” ۵۳۰ ” ”	
۱۹۶۳-۶۴ء ” ” ” ”	۱۲ ” ۷۶ ” ۹۶۰ ” ”	
۱۹۶۴-۶۵ء ” ” ” ”	۱۲ ” ۳۳ ” ۱۰۳ ” ”	
اور ۱۹۶۵-۶۶ء ” ” ” ”	۱۴ ” ۴۵ ” ۶۴۵ ” ”	

غور کرنے کی بات ہے کہ جب ۹ لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا تو آمدنی ۵۷ لاکھ ۹۲ ہزار روپیہ تھی، اور جب زیر کاشت رقبہ ۱۴ لاکھ ایکڑ سے بھی زیادہ ہوگیا تو آمدنی ۴۷ لاکھ ۵۳ ہزار روپیہ رہ گئی۔ مزید غور طلب پہلو یہ ہے کہ غلام محمد بیراج میں مالیہ کی جو شرح ہے اس کے حساب سے ۱۴ لاکھ ایکڑ پر آمدنی ۱۷۵ لاکھ ۹۶ ہزار روپیہ ہونی چاہیئے، لیکن وصول صرف ۴۷ لاکھ ۵۳ ہزار روپیہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ آخر کیا ہے؟

سرکاری خزانے کے ضیاع کی مثالیں

سرکاری خزانے کے ضیاع کی یوں تو ہزارہا مثالیں ہیں لیکن صرف دو مثالیں محض نمونے کے طور پر دی جارہی ہیں:

(۱) جنوری ۱۹۴۹ء سے مارچ ۵۵ء تک بعض بڑے بڑے زمینداروں کو بل ڈوزر کرائے پر دئے گئے۔ نہ کوئی معاہدہ تھا نہ کوئی تحریر۔ ۵۵ء میں جب رقوم طلب کی گئیں تو بعض زمینداروں نے چند رسیدیں پیش کیں کہ ۱۱ ہزار ۴۸۹ روپے ایک رینج افسر صاحب وصول کر لے گئے ہیں۔ کل رقم ۹۴ ہزار ۹۸۲ روپے کی ہے۔ رینج افسر ملازمت چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور ابھی تک کچھ وصول نہیں ہوا۔ (پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی رپورٹ برائے سال ۶۱-۱۹۶۰ء مطبوعہ گزٹ (غیر معمولی) مورخہ یکم مئی ۱۹۶۸ء صفحہ ۱۶۴۰)

(۲) گورنر کی معائنہ ٹیم نے راولپنڈی سٹیلائٹ ٹاؤن میں فرش لگانے کے لیے مختص کردہ رقم کے خرد برد کی تحقیقات مکمل کر لی ہے۔ تحقیقات کے دوران میں ثابت ہوگیا ہے کہ سٹیلائٹ ٹاؤن میں گلیوں اور سڑکوں کو پختہ کرنے کا کام شروع ہی

نہیں کیا گیا اور محکمہ پی ڈبلیو ڈی اور ہاؤسنگ اور سیٹلمنٹ ایجنسی نے حکومت مغربی پاکستان کو لکھ دیا کہ کام مکمل ہو گیا ہے اور مختص کردہ رقم صرف کر دی گئی ہے۔

(امروز مورخہ ۱۷، اکتوبر ۱۹۶۶ء)

باب چہارم

زرعی پالیسی

قدرتی ذرائع

پاکستان درحقیقت ایک زرعی ملک ہے جس کی اسّی فیصدی آبادی دیہات میں ہے جس کا دار و مدار زراعت پر ہے۔

پاکستان کا کل رقبہ ۳ لاکھ ۶۵ ہزار ۵۲۹ مربع میل (مغربی پاکستان ۳ لاکھ ۱۰ ہزار ۴۰۳ مربع میل اور مشرقی پاکستان ۵۵ ہزار ۱۲۶ مربع میل) ہے۔ کل آبادی ۱۱ کروڑ ہے، جس میں سے ۵۴ فیصدی آبادی مشرقی پاکستان میں اور ۴۶ فی صدی مغربی پاکستان میں ہے۔

کل اراضی ۲۲ کروڑ ۳۳ لاکھ ایکڑ ہے جس میں سے صرف ۱۲ کروڑ ۴۵ لاکھ ایکڑ رقبہ کا سروے ہو سکا ہے اور بقیہ دس کروڑ ایکڑ رقبے کا ابھی تک ابتدائی سروے بھی نہیں ہو سکا۔ سروے شدہ رقبے میں سے ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ ابھی تک زیر کاشت نہیں لایا جا سکا اور جو رقبہ کاشت کے قابل ہے اس میں سے صرف ۹۰ لاکھ ایکڑ رقبے میں ایک سے زیادہ دفعہ سال میں کاشت ہوتی ہے۔

(بحوالہ رپورٹ فضل الرحمٰن خاں، کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۶ جون ۶۸ء)

وزیر زراعت نے زیر کاشت رقبے کے متعلق جو اعداد و شمار مہیا کئے ہیں، وہ یہ ہیں:

مشرقی پاکستان کل رقبہ زیر آبپاشی: ۴۱ لاکھ ۴۱ ہزار ایکڑ۔ کل رقبہ جس میں چاول کاشت ہو رہا ہے: ۲ کروڑ ۲۴ لاکھ ۴۱ ہزار ایکڑ۔

مغربی پاکستان کل رقبہ زیر آبپاشی: ۲ کروڑ ۸۲ لاکھ ۶۶ ہزار ایکڑ۔ کل رقبہ جس میں گندم کاشت ہو رہی ہے: ۱ کروڑ ۳۲ لاکھ ۵ ہزار ایکڑ۔ کل رقبہ جس میں چاول کاشت ہو رہا ہے، ۴۳ لاکھ ۸۳ ہزار ایکڑ۔ مغربی پاکستان میں کل رقبہ جو بیکار پڑا ہے: ۷ کروڑ ۸۳ لاکھ ۷۰ ہزار ایکڑ جسے زیر کاشت لانے کی تدابیر پر غور ہو رہا ہے۔

(کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۹ رمئی ۱۹۶۸ء)

مندرجہ بالا معلومات قومی اسمبلی کے بجٹ اجلاس ۱۹۶۸ء میں مہیا کی گئی تھیں اور ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں زرعی اراضی کے متعلق اعداد و شمار کتنے ناقص ہیں اور سرکاری طور پر قومی اسمبلی میں جو معلومات مہیا کی جاتی ہیں وہ کس حد تک قابل اعتماد تصور کی جاسکتی ہیں۔

قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے کی کوششیں

جہاں تک قدرتی وسائل کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک میں ان وسائل کی کوئی کمی نہیں اور موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ آبادی کے لیے بھی یہاں وسائل موجود ہیں۔ صرف ان وسائل سے مناسب طریقے پر فائدہ اٹھانے کے لیے منصوبہ بندی اور کوشش کی ضرورت ہے۔ جو کوششیں آج تک کی گئی ہیں اور جو نتائج ان کوششوں سے برآمد ہوئے ہیں وہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

غلام محمد بیراج

روزنامہ مشرق اپنی ۲۷ مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں غلام محمد بیراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"غلام محمد بیراج کی اراضی غلط منصوبہ بندی کا شکار ہو چکی ہے۔ زرعی ترقیاتی کارپوریشن ان زمینوں پر ۸۵ کروڑ روپیہ صرف کر چکی ہے، اور کسانوں کا بھی تقریباً اتنا ہی سرمایہ صرف ہو چکا ہے۔ ۷۰ کروڑ روپیہ لگانے کے باوجود بیراج کی یہ زمین غلہ پیدا کرنے کی بجائے شور اُگل رہی ہے۔

اس علاقے کی لاکھوں ایکڑ اراضی میں سے صرف چند ہزار ایکڑ اراضی پر کاشت کی جا رہی ہے۔ اس سال ربیع کی فصل پر ڈیڑھ لاکھ من سے زیادہ غلہ حاصل نہیں ہوگا جو کراچی جیسے شہر کو صرف ۶ دن کی خوراک مہیّا کر سکتا ہے۔

ان زمینوں پر کاشت کرنے والے ایک کاشتکار نے دل برداشتہ ہو کر بتایا کہ دو تین لاکھ روپے خرچ کرنے کے بعد توقع تھی کہ ۱۸ ایکڑ زمین سے ڈھائی سو من اناج پیدا ہوگا لیکن اس وقت یہ زمین صرف ۲۴ من اناج پیدا کر رہی ہے۔"

بیراجوں کے ذریعہ زیرِ آبپاشی آنے والے رقبہ کی تقسیم

غلام محمد بیراج: کل رقبہ: ۲۸ لاکھ ۶ ہزار ۲۱۰ ایکڑ۔
جو ہاریوں اور چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم کیا گیا۔

۳ لاکھ ۸ ، ۷ ہزار ۶۶۲ ایکڑ

گدو بیراج : کل رقبہ : ۳۷ لاکھ ۵۳ ہزار ۰۰ ، ۷ ایکڑ
ہاریوں اور چھوٹے کاشت کاروں کو جو دیا گیا :

۹۵ ہزار ۸۶۷ ایکڑ

تونسہ بیراج : کل رقبہ : ۱۵ لاکھ ۸ ، ۷ ہزار ۳۱ ، ۷ ایکڑ

اس طرح کم وبیش ۸۱ لاکھ ایکڑ رقبہ جو بیراجوں کے ذریعے نہری رقبہ میں تبدیل ہوا ہے اس میں سے عام چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعین کو صرف ۴ لاکھ ۴ ، ۷ ہزار ۵۳۰ ایکڑ رقبہ دیا گیا ہے کروڑوں روپیہ صرف کر کے جس رقبے کی آبپاشی کا انتظام کیا گیا ہے اس میں سے عام لوگوں کے حصے میں ۵ - ۶ فیصدی سے زیادہ نہیں آیا۔
(کارروائی صوبائی اسمبلی ۔ مطبوعہ امروز مورخہ ۲۹ رجون ۱۹۶۷ء)

سرکاری افسر غیر حاضر زمیندار

یہ اراضی جس طرح تقسیم کی جا رہی ہے وہ ایک انتہائی خطرناک اور معاشی طور پر تباہ کن پالیسی ہے ۔ ملک میں پہلے ہی بڑے زمینداروں کی کوئی کمی نہیں تھی ، لیکن اب ایک نیا طبقہ "سرکاری افسر زمینداروں" کا پیدا کر دیا گیا ہے جو اپنے سرکاری اختیارات کو بھی ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں اور خود زمینوں سے غیر حاضر بھی ہوتے ہیں ۔ جن افسروں اور وزیروں کو یہ زرخیز اور نہری رقبے دئے گئے ہیں ان میں سے نمونے کے طور پر کچھ نام دئے جا رہے ہیں :

صوبائی وزیر مال نے بتایا کہ جن سرکاری افسروں اور وزراء کو سستے داموں زمینیں دی گئیں ان میں مندرجہ ذیل حضرات بھی شامل ہیں :

وزراء

ملک خدابخش بچہ وزیر زراعت	۱۵۸ ایکڑ
خان غلام سرور خاں وزیر مال	۲۴۰ ایکڑ
خاں حبیب اللہ خاں سابق وزیر داخلہ	۲۴۰ ایکڑ
مسٹر این ایم عقیلی وزیر خزانہ	۲۴۹ ایکڑ
بیگم این ایم عقیلی صاحبہ	۳۵۱ ایکڑ
مسٹر اختر حسین سابق گورنر مغربی پاکستان	۱۵۰ ایکڑ

جج صاحبان

جسٹس محمد منیر سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ	۱۵۰ ایکڑ
جسٹس ایس اے رحمان سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ	۱۵۰ ایکڑ
جسٹس عبدالعزیز سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ	۱۵۰ ایکڑ
جسٹس انعام اللہ خاں جج ہائی کورٹ	۲۴۰ ایکڑ
جسٹس محمد داؤد خاں 〃 〃	۲۴۰ ایکڑ
جسٹس فیض اللہ خاں 〃 〃	۲۴۰ ایکڑ

افسران

خان عبدالرشید خان ایڈیشنل کمشنر	۱۵۰ ایکڑ

کرنل اے ایس بی شاہ سابق چیئرمین پبلک سروس کمیشن
۱۵۰ ایکڑ

سید حسن ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن	۱۵۰ ایکڑ
ایم ایم احمد ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن	۱۵۰ ایکڑ
ملک عطا محمد نون ڈی آئی جی پولیس	۱۵۰ ایکڑ
جنرل کے۔ ایم شیخ	۱۵۰ ایکڑ
مسٹر نور اللہ ریلوے انجینئر	۱۵۰ ایکڑ
این اے قریشی، چیئرمین ریلوے بورڈ	۱۵۰ ایکڑ
امیر محمد خاں سیکرٹری محکمۂ صحت	۲۳۸ ایکڑ
ایس ایم شریف سیکرٹری تعلیم	۲۳۹ ایکڑ
خاں بخت خاں ڈی آئی جی پولیس	۲۴۰ ایکڑ
میجر جنرل اکبر خاں، روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن	۲۴۰ ایکڑ
بریگیڈیئر ایف۔ آر کلو ڈپٹی ڈائریکٹر خوراک	۲۴۰ ایکڑ
عبدالرشید خاں کمشنر	۲۴۰ ایکڑ
محمد علی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی	۱۰۰ ایکڑ
ایم۔ ڈبلیو عباسی چیف سیکرٹری	۲۴۷ ایکڑ

(کارروائی صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان مورخہ ۱۳؍جون ۶۷ء)

زرعی اصلاحات تقسیم اراضی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا کارنامہ زرعی اصلاحات کا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی رہی

ہے کہ اس سے بڑی زمینداریوں کو ختم کرنے اور مزارعین کو زمینوں کی ملکیت دینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو ان اصلاحات سے بڑی زمینداریوں کو تحفظ دیا گیا ہے اور کاشتکاروں کے حصّے میں بہت ہی کم رقبہ آیا ہے۔ صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان کے بجٹ اجلاس ۱۹۶۸ء میں جو تفصیلات حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں ان پر صرف ایک نظر ڈالنے سے تمام صورت حال سامنے آجاتی ہے:

کل رقبہ جو زرعی اصلاحات کے تحت بڑے زمینداروں سے قیمت ادا کر کے حاصل کیا گیا	۲۲ لاکھ ۹ ہزار ۴۶۴ ایکڑ ہے
رقبہ جو نیلام کیا گیا	۱ لاکھ ۴۸ ہزار ۴۳۲ ایکڑ
رقبہ جو ویسے ہی فروخت کیا گیا	۵ لاکھ ۳۵ ہزار ۶۰۶ ایکڑ
رقبہ جسے بہتر بنایا جا رہا ہے	۲ لاکھ ۳۵ ہزار ۴۲۱ ایکڑ
رقبہ جو حکومت کے محکمہ کو دیا گیا	۳ لاکھ ۳۵ ہزار ۷۵۸ ایکڑ
رقبہ جو ابھی تک موجود ہے	۸ لاکھ ۶۱ ہزار ۲۱۳ ایکڑ
رقبہ جو مزارعین اور کاشتکاروں کو دیا گیا	۳۷ ہزار ۲۷۴ ایکڑ

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں پر یہ احسان عظیم کیا گیا تھا اور جن کی بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا انہیں ۲۲ لاکھ ایکڑ میں سے صرف ۳۷ ہزار ایکڑ زمین ملی اور اس کی بھی حالت یہ ہے کہ وہ سخت پریشان ہیں۔ باقی رقبہ فروخت کر دیا گیا یا نیلام کر دیا گیا اور وہ بڑے زمینداروں کے رشتہ داروں اور سرکاری افسروں کے پاس چلا گیا۔

مزارعین اور چھوٹے کاشتکاروں کا سر احسان عظیم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور اصلاحات کا فائدہ زمینداروں اور سرکاری افسروں نے اٹھایا ہے۔

(کارروائی صوبائی اسمبلی بجٹ اجلاس ۱۹۶۸ء مسٹر حمزہ کے سوالات کے جوابات)

زرعی اصلاحات کے تحت حاصل کردہ رقبہ زمینداروں ہی کے پاس ہے

زرعی اصلاحات کے تحت جو رقبہ زمینداروں سے لیا گیا تھا اور اس کی قیمت ادا کر دی گئی تھی وہ رقبہ ان زمینداروں ہی کی تحویل میں دے دیا گیا ہے اور اگرچہ یہ اراضی ان کے پاس پٹے پر ہے لیکن ان سے کچھ بھی وصول نہیں کیا جاتا۔ بالکل بلا کرایہ دی گئی ہے۔ جن خوش نصیب حضرات نے بدنصیب مزارعین کا حق دبا رکھا ہے ان کی تعداد ۶۶ ہے اور ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ کل رقبہ ۲ لاکھ ایکڑ سے زیادہ ہے۔

۱	سلطان احمد چانڈیو	۱،۲۳،۳۸۱	ایکڑ
۲	امیر بہاول پور	۲۰،۰۰۰	ایکڑ
۳	ملک امیر محمد خاں سابق گورنر اور اس کے صاحبزادے	۱۸،۶۱۹	ایکڑ
۴	ملک خضر حیات خاں ٹوانہ	۷،۷۰۰	ایکڑ
۵	میر صاحب، خیرپور	۵،۲۳۹	ایکڑ
۶	حاجی غلام رسول	۳،۷۸۷	ایکڑ
۷	غلام محمد خاں اور علی گوہر خاں	۴،۰۶۱	ایکڑ

۸	نواب سر فرید	۱،۸۱۸	ایکڑ
۹	گل حسن شاہ مو سری شریف	۳،۱۲۴	ایکڑ
۱۰	کرنل سید عابد حسین	۱،۰۷۵	ایکڑ
۱۱	غلام محمد شاہ وغیرہ	۱،۰۷۵	ایکڑ
۱۲	پیر صاحب رانی پور	۳۶۷	ایکڑ
۱۳	ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر خارجہ	۱۷۸	ایکڑ
۱۴	میاں جمال شاہ	۵۰۰	ایکڑ
۱۵	نواب مہر شاہ	۹۳۶	ایکڑ
۱۶	کرنل محمد علی نون	۱،۴۸۲	ایکڑ
۱۷	میاں محمد سعید قریشی	۱،۵۰۰	ایکڑ
۱۸	کرنل کننگھم	۲،۹۴۸	ایکڑ
۱۹	مسٹر ٹیلر	۷،۷۲۳	ایکڑ
۲۰	محمد امین خاں	۵۰۰	ایکڑ
۲۱	گل شیر خاں نون	۳،۱۷۱	ایکڑ
۲۲	خان بہادر سردار دوست محمد خاں	۴،۱۹۰	ایکڑ
۲۳	چوہدری ظفر اللہ خاں	۴،۰۵۶	ایکڑ
۲۴	میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ	۲۸	ایکڑ
۲۵	غلام محی الدین	۵۰۰	ایکڑ

(کارروائی صوبائی اسمبلی۔ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء)

سرحدی اضلاع کی زمینیں

حکومت نے ایک منصوبے کے تحت مختلف اضلاع کے سرحدی علاقوں میں بھی زمینوں کو قبضے میں لیا ہے۔

جو زمینیں لی گئی ہیں ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

ضلع	رقبہ
سیالکوٹ	۴۷،۵۰۰ ایکڑ
شیخوپورہ	۱۲،۵۰۰ ایکڑ
لاہور	۵۴،۲۰۰ ایکڑ
ساہیوال	۲۳،۷۵۰ ایکڑ
بہاول نگر	۴۲،۷۰۰ ایکڑ

(کارروائی صوبائی اسمبلی بجٹ اجلاس ۱۹۶۸ء)

نامنصفانہ تقسیم

اراضی کی نامنصفانہ تقسیم نے ملک کے اندر دو طبقے پیدا کر دیئے ہیں جن میں سے ایک طبقہ ایسا ہے جو بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہونے کی وجہ سے اختیارات بھی رکھتا ہے اور جب آبپاشی کا انتظام ہوتا ہے تو اراضی کے بڑے بڑے قطعات پر بھی قبضہ جما لیتا ہے اور عشرت کی زندگی گزار رہا ہے اور دوسرا طبقہ غریب کاشتکاروں کا ہے جو انتہائی بے بس ہے۔

ایک سروے کے مطابق صرف مغربی پاکستان میں ۱۰۰ سے ۵۰۰ ایکڑ زمین رکھنے والے زمینداروں کی تعداد ۶۳ ہزار ہے اور جن کاشتکار کنبوں کے پاس ۵ ایکڑ سے بھی کم زمین ہے، ان کنبوں کی تعداد ۳۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔

مغربی پاکستان میں کاشتکاروں کی کل تعداد ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ہے جس میں سے صرف ۶۲ لاکھ خودکفیل ہیں اور ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ کاشتکاروں کو دوسرے وسائلِ رزق تلاش کرنے کے لیے سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بڑی تعداد بڑے زمینداروں کے مزارعین کے طور پر اپنی گزراوقات کرتی ہے۔ مشینی کاشت کا سلسلہ شروع ہو جانے سے یہ لوگ مزید پریشانیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

زیرِ کاشت رقبہ

مختلف بیراجوں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعہ جس رقبہ کی آبپاشی کا انتظام ہوا ہے وہ اعداد و شمار کے مطابق کسی طرح بھی ایک کروڑ ایکڑ سے کم نہیں ہے۔ صرف تین بیراجوں سے ۸۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبے کی آبپاشی کا انتظام ہو چکا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو زمینیں دی گئی ہیں، ان کی اکثریت غیر کاشتکار ہے۔ اس لیے پوری طرح کاشت کا انتظام ابھی تک نہیں ہو سکا۔ مندرجہ ذیل نقشے سے اندازہ ہوگا کہ کتنے رقبہ میں بڑی بڑی فصلیں مختلف سالوں میں کاشت کی گئیں :

پورے پاکستان میں

	سنہ ۵۰-۱۹۴۹ء	سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء	سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء
(۱) چاول	۲۱،۸۳۳ ہزار ایکڑ	۲۴،۱۲۵ ہزار ایکڑ	۲۵۸۹۷ ہزار ایکڑ
(۲) گندم	۱۰،۴۳۴ ہزار ایکڑ	۱۲،۱۹۳ ہزار ایکڑ	۱۳۳۸۵ ہزار ایکڑ
(۳) کپاس	۲۷۹۹ ہزار ایکڑ	۳۳۷۰ ہزار ایکڑ	۳۹۷۵ ہزار ایکڑ

(۴) پٹ سن ۱۰۷۳ ہزار ایکڑ، ۹۹۲ ہزار ایکڑ، ۱۱۴۳ ہزار ایکڑ
(بیسک فیکٹس چھٹا ایڈیشن محکمہ فائنس حکومت پاکستان)

پیداوار پیداوار کا نقشہ درج ذیل ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ پیداوار میں اضافہ کس نسبت سے ہوا ہے۔

پیداوار مختلف سالوں میں

	سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء	سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء
(۱) چاول	۸۱۹۵ ہزار ٹن	۹۴۶۱ ہزار ٹن	۱۰۷۶۷ ہزار ٹن
(۲) گندم	۳۹۵۰ ہزار ٹن	۳۸۷۶۰ ہزار ٹن	۴۳۲۴ ہزار ٹن
(۳) کپاس	۲۴۹ ہزار ٹن	۲۹۰ ہزار ٹن	۴۵۰ ہزار ٹن
(۴) پٹ سن	۱۰۷۳ ہزار ٹن	۹۹۲ ہزار ٹن	۱۱۴۳ ہزار ٹن

(بیسک فیکٹس شائع کردہ حکومت پاکستان)

اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ ۸۰ لاکھ ایکڑ اراضی صرف مغربی پاکستان میں بیراجوں کے بعد زیر آبپاشی آچکی ہے اور ہزارہا ٹیوب ویل بھی نصب ہو چکے ہیں تو پیداوار میں اضافہ محض برائے نام رہ جاتا ہے۔

پٹ سن کی پیداوار پٹ سن کی پیداوار کے متعلق پاکستان آبزرور ڈھاکہ اپنی ۲۹ دسمبر ۶۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ تقسیم کے وقت سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء تک مشرقی پاکستان پٹ سن کی ۸۰ لاکھ گانٹھیں برآمد کرنے کے لیے مہیا کرتا تھا اور سنہ ۱۹۶۶ء تک پہنچتے پہنچتے گانٹھوں کی تعداد

صرف ۶۰-۶۵ لاکھ رہ گئی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ وہ اب ۷۰ لاکھ گانٹھیں باہر بھیج رہا ہے اور اس نے پٹ سن کی پیداوار میں ۵۰۰ فیصدی اضافہ کر لیا ہے۔ چنانچہ چند سالوں کی پیداوار کا تقابلی مطالعہ اس حقیقت کو ثابت کر دیتا ہے۔

پٹ سن کی برآمد

سال	پاکستان	ہندوستان
سنہ ۱۹۴۷-۴۸	۶۹ لاکھ گانٹھیں	۱۷ لاکھ گانٹھیں
سنہ ۱۹۵۷-۵۸	۶۱ لاکھ گانٹھیں	۶۰ لاکھ گانٹھیں
سنہ ۱۹۶۲-۶۳	۶۴ لاکھ گانٹھیں	۶۶ لاکھ گانٹھیں
سنہ ۱۹۶۳-۶۴	۶۳ لاکھ گانٹھیں	۷۲ لاکھ گانٹھیں

پٹ سن کی اہمیّت

پاکستان کی برآمدات میں پٹ سن سب سے اہم ہے اور زرمبادلہ کے حصول کے لیے یہ اہم ترین پیداوار ہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کی تمام برآمدات سے حاصل شدہ زرمبادلہ کا ۵۱ فیصدی حصہ صرف پٹ سن کی برآمد سے حاصل ہُوا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں ہم نے ۱۵۳ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے کا پٹ سن برآمد کیا اور ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۴۳ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ کا زرمبادلہ حاصل کیا۔ ایسا ملک جو اربوں روپے غیر ملکی قرضے کے نیچے دبا ہُوا ہو اور اس کے پاس زرمبادلہ حاصل کرنے کا ایک ایسا ذریعہ بھی موجود ہو جس پر کسی زمانے میں اسے اجارہ داری حاصل تھی اور وہ محض اپنی غفلت اور لاپروائی سے

اس تجارت کے میدان میں ایک پڑوسی ملک سے صرف اس لیے پیچھے رہ گیا ہو کہ پڑوسی ملک نے اس طرف خصوصی توجہ دے کر مارکیٹ پر قبضہ کر لیا تو ایسے ملک کے حکمرانوں کو اپنی ترقیات پر فخر کرنے کے بجائے اپنی ناکامیوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔

قومی اسمبلی کے سرمائی اجلاس منعقدہ ڈھاکہ میں وزیر زراعت نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۸-۵۹ء میں پٹ سن کی پیداوار ۱۹ من فی ایکڑ تھی، جو کم ہوتے ہوتے سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ۱۴ء۴ من فی ایکڑ رہ گئی ہے۔

(کارروائی قومی اسمبلی ۱۵ ردسمبر سنہ ۱۹۶۸ء)

زرعی ترقیات کا بے سروپا پگنیڈا

زرعی ترقیات کا بے سروپا پروپگنڈا جس طرح سے کیا جارہا ہے اس کی صرف ایک مثال یہاں پیش کی جارہی ہے۔ یہ ایک خبر ہے جو "جنگ" مؤرخہ یکم نومبر سنہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔

۹۱۴۰ جلسے اور ۲۰۰ فلم شو

نواب شاہ، ۲۶ر اکتوبر۔ خیرپور ڈویژن کے کاشتکاروں کو گندم کی کاشت کے جدید طریقوں کی تربیت دینے کی غرض سے محکمۂ زراعت نے ایک تعلیمی مہم شروع کی ہے۔ پروگرام کے مطابق سالِ رواں کی آخری سہ ماہی کے دوران ڈویژن کے مختلف دیہات میں تقریباً ۹۱۴۰ عام جلسے منعقد کئے جائیں گے۔ اسی مدت کے دوران میں دوسو فلم شو بھی منعقد کرنے کے لیے ضروری انتظامات کئے جائیں گے۔

اس خبر کو ملاحظہ فرمایئے جو ۲۶ر اکتوبر کو جاری ہوئی ہے اور ۳۱ر دسمبر تک ۹۱۴۰ جلسے اور ۲۰۰ فلم شو منعقد کرنے کا پروگرام ہے ۲۰۰ سے زیادہ جلسے روزانہ

کیا، عملاً ممکن نہیں اور کوئی ایک بھی جلسہ منعقد ہُوا۔ یہ فریب آخر کس سے کیا جا رہا ہے؟ سرکاری مشینری پروپگنڈے کے شوق میں انتہائی مضحکہ خیز خبریں نشر کرتی رہتی ہے۔

زرعی ترقیات کی حقیقت

روزنامہ امروز نے اپنی ۴، نومبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں "ہمارے ملک کی تین چوتھائی زمین بیکار پڑی ہے" کے زیرِ عنوان تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مغربی پاکستان کا قابل کاشت رقبہ تقریباً ۹ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ ہے۔ اس میں سے اس وقت صرف چار سے پانچ کروڑ ایکڑ پر کاشت جاری ہے۔ باقی تمام اراضی بیکار پڑی ہے۔ غفلت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے وسیع و عریض علاقوں کا ابھی تک سروے بھی نہیں ہُوا۔ ظاہر ہے کہ یہ علاقے ہمارے تخمینوں میں شامل ہی نہیں کئے جا رہے۔ جو رقبہ اس میں سے زیرِ کاشت بھی ہے اس میں سے بھی تقریباً نصف پر ابھی تک جوار، باجرہ، جنٹی، جو، چنے وغیرہ جیسی غیر منفعت بخش فصلیں ہی کاشت ہو رہی ہیں، جس سے پاکستان کی زرعی معیشت استوار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کروڑ ہا ایکڑ لق و دق چٹیل میدان پڑے ہیں۔ اور ان میں بعض وہ رقبے بھی شامل ہیں جن میں ۱۵ سے ۳۰ انچ تک سالانہ بارش ہوتی ہے۔"

اس تبصرہ پر کسی مزید اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔

زرعی معیشت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لیے کیا ہونا چاہیے تھا!

زرعی مسائل کو حل کرنے کے لیے تقسیم ملک کے بعد متعدد کمیشن مقرر کئے

گئے جن میں اہم اختر حسین کمیٹی، زرعی ترقیاتی کمیٹی، لارڈ باؤنڈور کمیٹی، زرعی کمیشن اور زرعی اصلاحات کمیشن شامل ہیں۔ اسی طرح زرعی ترقی کے لیے زرعی یونیورسٹی، زرعی ترقیاتی کارپوریشن اور متعدد تجربہ گاہیں قائم کی گئیں۔ لیکن ان تمام کے نتائج حوصلہ شکن ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اصلاح کے لیے کوئی نظریہ اگر پیش نظر تھا تو وہ وہی بوسیدہ سرمایہ داری نظام تھا اور اگرچہ اسلام کا نام بار بار لیا گیا لیکن اس میں نیت کی خرابی بھی موجود تھی اور ذہنیت کی خرابی بھی۔ اس لیے کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہو سکے اور نہ اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول ہی کے مطابق معاشرہ تعمیر کیا جا سکا۔

(۱) تقسیم ملک کے بعد اوّلین کام یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مہاجر کنبوں میں سے ہر کاشتکار کنبے کو کم از کم ۲۵ ایکڑ زمین دی جاتی۔ جن لوگوں کی سابقہ ملکیت ۲۵ ایکڑ سے کم تھی، انہیں ۲۵ ایکڑ، اور جن کی زیادہ تھی ان کے لیے بھی زیادہ سے زیادہ ایک حد مقرر کر دی جاتی تاکہ ملکیت کا تفاوت زیادہ نہ رہتا۔ اس بات کے لیے کوئی دلیل موجود نہ تھی کہ ہندوستان کے جاگیرداروں کو پاکستان میں بھی لازماً جاگیردار بنایا جاتا۔ پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ زمین مالِ فے تھی اور اسے کفالت کے اصول پر تقسیم ہونا چاہیئے تھا۔

(۲) دوسرا معاملہ سرکاری زمینوں کا تھا۔ یہ زمینیں بھی ۲۵ ایکڑ فی کنبہ کے حساب سے ان مقامی کاشتکاروں کو تقسیم ہونی چاہیئے تھیں جنکی ملکیت ۲۵ ایکڑ سے کم ہے۔

(۳) جن مقامی لوگوں کو سکھوں یا انگریزوں کی خدمات کے صلے میں جاگیریں

عطا ہوئی تھیں انہیں بھی گذارہ یونٹ کی حد تک ملکیت رکھنے کی اجازت دی جاتی اور بقیہ زمین دوسرے مستحق کاشتکاروں کو تقسیم کر دی جاتی۔

(۴)- اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جن سرکاری افسروں، ارکان اسمبلی، وزراء کو سیاسی رشوت کے طور پر بڑے بڑے قطعاتِ اراضی دیئے گئے ہیں۔ انہیں بیک قلم منسوخ ہو جانا چاہیئے اور محض مستحقین کے پاس گذارہ یونٹ کی حد تک زمین رہنی چاہیئے۔ اس بات کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ چونکہ پالیسی بنانے اور اراضی کی تقسیم کا تمام کام ان کے ہاتھوں میں تھا اور انہوں نے خوب خوب ہاتھ رنگے ہیں، اس لیے ان زمینوں کو ان لوگوں کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔ اور وہ بیک وقت صاحبِ اختیار افسر، بڑے بڑے زمیندار اور بعض حالتوں میں صنعت کار اور بینکر بھی بنے رہیں اور اس طرح دولت و اختیارات و وسائل پر قابض رہ کر اور اپنے اختیارات کو غلط طور پر استعمال کر کے معاشرے کو اسلام کے دیئے ہوئے حقوق اور عدلِ عمرانی سے بھی محروم کر یں اور ملک میں صحت مند قسم کے جمہوری نظام کے قیام کا راستہ بھی روکیں۔

(۵) جن فوجی افسروں نے بہادری کے کارنامے انجام دیئے ہیں اور ان کارناموں کے صلے میں انہیں سرکاری زمینیں عطا کی گئی ہیں انہیں مناسب حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام دوسرے لوگوں کو جنہیں محض "اختیارات" کی بدولت بڑے بڑے رقبے عطا کئے گئے ہیں ان کا معاملہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔

(۶) زرعی اصلاحات کے تحت جتنی اراضی قبضے میں لی گئی ہے وہ تمام کی تمام مزارعین کا حق ہے اور صرف انہی کو ملنا چاہیئے۔

(۷)۔ دوسری افتادہ اراضی جو آبادکاری کے لیے کاشتکاروں کو دی گئی تھی، خواہ مستقل طور پر یا عارضی طور پر، انہیں کسی طرح بھی بے دخل کرنا جائز نہیں ہے اور آبادکاری سے ہی ان کا حق ملکیت ثابت ہو چکا ہے۔ اس حق کو تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

زمین کی نامنصفانہ تقسیم کے مسئلے کے حل کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا جانا چاہیئے، جس کا صدر کوئی سپریم کورٹ کا ریٹائرڈ جج ہو۔ ریونیو کے دو سینئر ریٹائرڈ افسر جن کی شہرت اچھی ہو، دو روشن خیال علمائے دین اور دیوانی قانون کے ماہر وکلاء اس کمیشن میں شامل ہوں۔ اس کمیشن کے حدودِ کار بہت وسیع ہوں اور وہ تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر قابلِ عمل سفارشات پیش کریں اور ان شرعاً جائز ملکیتوں کو چھوڑ کر جو صحیح اسلامی طریق سے باقاعدہ تقسیم ہوتی آرہی ہوں باقی تمام ملکیتوں کا محاسبہ کریں اور کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کر دیں تاکہ معاشرہ مصنوعی اونچ نیچ اور سرمایہ دارانہ طرزِ فکر سے آزاد ہو اور ہر کنبہ عزت و آبرو اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

اراضی کی نامنصفانہ تقسیم ملک میں بہت پیچیدہ مسائل پیدا کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے اور جہاں ایک طرف لاکھوں کنبے اپنی ضروریات پوری کرنے سے بھی قاصر ہیں اور افرادی قوت بھی ضائع ہو رہی ہے، وہاں دوسری طرف غیر حاضر زمینداروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تمام محنت اور خرچ کے باوجود پیداوار میں اضافہ ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ غیر حاضر زمیندار زمین کی طرف توجہ دینے کی نہ تو ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ اس کے پاس وقت ہے۔

زرعی وسائل کا سروے

پاکستان میں کروڑ ہا ایکڑ رقبہ ابھی تک ویران پڑا ہے اور اس کا ابتدائی سروے بھی نہیں کیا گیا۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس وسیع و عریض رقبے کو استعمال میں لانے کے لیے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ اس کے لیے فوری طور پر ضرورت ہے کہ:

۱۔ جس طرح مشرقی پاکستان میں ابتدائی سروے کا کام شروع کیا گیا ہے، اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی سروے شروع کیا جائے۔

۲۔ زمین کو صلاحیتِ پیداوار کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے اور کیمیاوی تجزیہ سے معلوم کیا جائے کہ کن زمینوں میں کیمیاوی نمکیات کی کس حد تک کمی ہے اور اس کمی کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جو علاقے درخت پیدا کرنے اور جنگل اگانے کے کام آ سکتے ہوں محکمہ جنگلات ان علاقوں کی طرف توجہ کرے اور کاشتکاروں کو پریشان کرنے اور ان پر مقدمات قائم کرنے کی بجائے کوئی مثبت کام کرے۔

۴۔ فصلوں کے اعتبار سے مختلف علاقوں کی تقسیم کی جائے اور ان پر فصلیں اگانے کا کام کیا جائے۔ محکمہ زراعت کو کاشتکاروں پر بوجھ بننے کی بجائے مفید مشورے دینے کا کام کرنا چاہیئے اور غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کی طرف توجہ کی جانی چاہیئے۔

۵۔ پاکستان میں کاشت کا سلسلہ دوسرے ممالک سے مختلف ہے۔ ہمیں ایسی فصلوں کی ضرورت ہے جو انسانوں کے لیے خوراک اور حیوانوں کے لیے

چارہ بھی مہیا کر سکیں۔ ہمیں اندھا دھند دوسرے ممالک کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔

۶۔ زمین کی قوت پیداوار میں جہاں جہاں کمی ہو رہی ہے یا سیم اور تھور زمین کو خراب کر رہی ہیں، اسے درست کرنے کے لیے محکمۂ زراعت کو کام کرنا چاہیئے۔

دیہات سدھار اور حکومت کا بوجھ

دیہات کو سدھارنے کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ حکومت کا بوجھ ہے جسے عام دیہاتی کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا اور سرکاری افسروں کی پوری رجمنٹ اس کی پریشانیوں میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ اس میں بڑا دخل ہمارے غلط سیاسی نظام کا ہے اور نظامِ محاصل کا اور پھر سرکاری ملازمین کی اس ذہنیت کا کہ ان میں سے ہر ایک تھانیدارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ ایک عام دیہاتی کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی سرکاری ملازمین کی فوج کا اندازہ کرنے کے لیے ذرا تصوّر کیجئے کہ اس پر حکم چلانے والے کتنے لوگ ہیں اور رشوت دے کر اسے کتنے ملازمین کے شر سے محفوظ رہنا پڑتا ہے۔

۱۔ اول گاؤں کا نمبردار ہے جس کے حکم کی سرتابی ممکن ہی نہیں۔

۲۔ دوسرا پٹواری ہے جسے زمین کا اصل مالک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ بنیادی جمہوریت کا ممبر ہے جو آج کل حکومت ہے۔

۴۔ بنیادی جمہوریت کا چیئرمین ہے جو بڑی حکومت ہے۔

۵۔ محکمہ زراعت کا فیلڈ اسسٹنٹ، انسپکٹر زراعت اور بڑے افسر ہیں۔

۶۔ محکمہ اکسائز کے تمبا کو انسپکٹر اور دوسرے افسر۔

۷۔ تحصیلدار اور قانون گو وغیرہ

۸۔ تھانیدار اور پولیس کا پورا عملہ ہے جو کسی نہ کسی واردات کا انتظام کر کے دیہاتیوں پر مسلّط رہتا ہے اور کسی کی جان و مال محفوظ نہیں، جب تک کہ پولیس کو خوش نہ رکھا جائے۔

۹۔ کچہریوں کا وہ نظام ہے جس میں سول جج، مجسٹریٹ، وکلا تمام حضرات کے سامنے بے چارہ دیہاتی ہی ہے جو بے نوا ہے۔

۱۰۔ خاندانی منصوبہ بندی کا عملہ، اسے بچے کم پیدا کرنے کے لیے مجبور کرنے کے لیے موجود ہے اور یہ سب افسر ہوتے ہیں۔

۱۱۔ محکمہ صحت کے ملازمین اور سینٹری انسپکٹر بھی اپنی افسری کا مظاہرہ کرنے میں کسی سے کم نہیں ہوتے۔

۱۲ وزراء اور سرکاری پارٹی کے ممبران بھی اپنا حق رکھتے ہیں اور ان کے احکام کی اطاعت میں ووٹ دینا اور جلسوں میں حاضرین بننا پڑتا ہے۔

۱۳۔ محکمہ جنگلات کا گارڈ، فارسٹر اور رینجر ہیں، جو چالان کرنے میں ماہر ہوتے ہیں

۱۴۔ محکمہ شکاریات کے انسپکٹر ہیں۔

۱۵۔ محکمہ انہار کے افسر ہیں۔

اس طرح سرکار کا اتنا بھاری بوجھ ہے کہ عام دیہاتی اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ حکومت کا ہر کارندہ چالان کرنے کے اختیارات رکھتا ہے اور ان اختیارات کو استعمال کرتا ہے اِلّا یہ کہ اسے فوراً ہی رشوت وصول ہو

جائے ورنہ چالان اور پھر سال بھر عدالت کے چکر اور وکیلوں کی فیس۔

یہ ہیں وہ حالات جو دیہاتی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں اور کوئی حکومت بھی اس بے انتہا بوجھ کو جائز ثابت کرنے کی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتی۔ اس OVER GOVERNMENT کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہاتی کسی بھی حکومت سے راضی نہیں ہو سکتے اور یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ہر حکومت اپنا سارا بوجھ ان پر لاد کر اپنے ملازمین کے لیے عیش و راحت اور حرام خوری کا انتظام کرتی ہے۔ نیم سرکاری اخبار روزنامہ امروز مورخہ ۱۵؍ دسمبر ۱۹۶۸ء نے "اننے رب تھلّے پٹواری" کے زیر عنوان حسب ذیل خبر شائع کی ہے:

سرکاری لوٹ کھسوٹ کی ایک مثال

دہاڑی ۱۴؍ دسمبر ——— آپ یقین کریں کہ سب ڈویژن دہاڑی میں بنیادی جمہوریتوں کے کنونشن کو گذرے عرصہ ہو چکا ہے مگر آج بھی اس کنونشن کے لیے چندہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ آج بھی محکمہ مال کے ایک پٹواری نے ایک زمیندار سائل کا اس وقت تک کام کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ اس نے بنیادی جمہوریتوں کے کنونشن تحصیل دہاڑی کے لیے جاری کردہ کاپی برائے فراہمی چندہ سے تیس روپے ادا کر کے رسید حاصل نہ کر لی۔ معلوم ہوا ہے کہ کنونشن سے قبل تحصیلدار کی طرف سے ہر پٹواری کو ایک ایک کاپی مہیا کی گئی تھی اور ان سے فی کس ایک سو روپیہ وصول کر لیا گیا تھا۔ لیکن پٹواری اس کاپی پر آج بھی چندہ وصول کیے بغیر کوئی کام کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر پٹواری اسی کاپی پر ایک سو سے کہیں زائد روپے بطور چندہ وصول کر چکے

ہیں اور مزید وصول کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔"

زرعی معیشت کی پاکیزگی کے لیے ضروری شرائط

ان حالات میں دیہاتی زندگی کو پاکیزہ بنانے اور زرعی معیشت کو استوار کرنے کے لیے ان اقدامات کی فوری ضرورت ہے اور یہ سارے اقدامات بیک وقت شروع ہونے چاہئیں:

۱۔ نامنصفانہ تقسیم اراضی کی پالیسی کو ترک کر کے منصفانہ تقسیم اراضی کا انتظام کیا جائے۔

۲۔ زمین کو زیر کاشت لانے کے لیے سروے کا انتظام کیا جائے اور محکمہ زراعت اور محکمہ جنگلات اپنی صحیح ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی طرف توجہ دیں۔

۳۔ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے مؤثر اقدامات کئے جائیں۔ تجربہ گاہیں اور اور کارپوریشن محض کچھ لوگوں کو ملازمتیں اور عہدے مہیا کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیئے۔

۴۔ دیہاتی آبادی پر سے حکومت کا بوجھ ختم کیا جائے اور لوگوں کو آزاد معاشی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔

۵۔ نظم و نسق کو رشوت اور بد دیانتی سے پاک کیا جائے۔

۶۔ بدقماش لوگوں کی سرپرستی ختم کی جائے اور بنیادی جمہوریتوں کو سرکاری مداخلت سے آزاد کر کے انہیں لوکل باڈیز کے طور پر کام کرنے دیا جائے۔

۷۔ سرکاری ملازمین کو سرکاری اور غیر سرکاری نیز حکومتی پارٹی اور بنیادی جمہوریتوں

کے کنونشنوں اور وزراء اور حکام کی آمد پر چندے فراہم کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جائے۔

۸۔ جن سرکاری ملازمین کا تعلق براہ راست عوام سے ہے ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور رشوت خوری اور رشوت ستانی کے تمام اسباب کو ختم کیا جائے۔

۹۔ سادہ زندگی گزارنے کی ترغیب دی جائے اور اس کے لیے سرکاری حکام کو اپنے ٹھاٹھ باٹھ ختم کرنے چاہئیں اور انگریزی لباس کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے۔

ان امور کی طرف توجہ کئے بغیر نہ کوئی اصلاح ممکن ہے اور نہ ترقی اور خوشحالی کی طرف کوئی قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔

○

باب پنجم

صنعتی ترقّی

صنعتی ترقی کی رفتار پچھلے بیس سال میں بہت تیز رہی ہے اور صنعتی لحاظ سے مُختلف شعبوں میں جو ترقی ہُوئی ہے وُہ حوصلہ افزا ہے۔ محکمۂ صنعت اور قدرتی وسائل کے سیکرٹری جناب ایس ایس جعفری صاحب نے پاکستان میں ترقی کا جو نقشہ پاکستان ٹائمز مؤرخہ ۲۳/۳/۶۸ میں پیش کیا ہے وُہ حسب ذیل ہے:

شعبہ	۱۹۵۰ / ۱۹۵۵	۱۹۵۵ / ۱۹۶۰	۱۹۶۰ / ۱۹۶۵	۱۹۶۵ / ۱۹۷۰
صنعت و حرفت ایندھن اور کان کنی	۳۶	۳۱	۲۸	۲۶
پانی اور بجلی :	۱۳	۱۷	۱۹	۱۵
ٹرانسپورٹ اور ذرائع آمدورفت	۱۴	۱۷	۱۷	۱۸
تعمیرات :	۲۲	۲۰	۱۵	۱۳
تعلیمات :	۵	۶	۴	۵
صحت :	۳	۲	۱	۲

ابتدائی دس سالہ ترقی بعد کے سالوں سے زیادہ تھی

اگرچہ یہ بات اس نقشے سے بالکل واضح ہے کہ ابتدائی دس سال میں ترقی کی رفتار بعد کے دس سال سے زیادہ تیز رہی ہے اور اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ ابتدائی سالوں میں ترقی اپنے وسائل سے ہوئی ہے اور بعد کے زمانے میں غیر ملکی قرضوں کی رہینِ منّت ہے تو یہ بات سابقہ حکمرانوں کے لیے باعثِ فخر ضرور ہو سکتی ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی مسرّت کا مقام نہیں ہے کیونکہ صنعتی میدان میں جو ترقی ہوئی ہے وہ خالص سرمایہ داری نظام کے تحت ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ اب یہ ہے کہ پورے ملک کی دولت گنتی کے چند خاندانوں کے اندر جمع ہو گئی ہے۔

دولت کا اِرتکاز

چنانچہ ڈاکٹر محبوب الحق چیف ایڈوائزر منصوبہ بندی کمیشن کے ارشاد کے مطابق پاکستان کے صرف بیس خاندانوں کے پاس:

(۱) صنعتی دولت کا	۶۶ فیصدی	
(۲) بیمہ کے کاروبار کا	۷۹ "	اور
(۳) بنکوں کے اثاثے کا	۸۰ "	حِصّہ ہے۔

اِن صنعت کاروں نے جس طرح لوٹ مچا رکھی ہے اور جو کھلی چھٹی انھیں دے دی گئی ہے اس پر اضطراب کا اظہار خود سرکاری حلقوں میں بھی ہونا شروع ہو گیا ہے اور پاکستان ٹائمز اپنی ۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے اداریے میں لکھتا ہے کہ:

بدکردار صنعت کار

"قومی اقتصادی کانفرنس کے اجلاس میں کارخانہ داروں کو سخت تنقید کا ہدف بننا پڑا۔ سب سے زیادہ مذمت جناب ایس ایس جعفری صاحب سیکرٹری صنعت و حرفت گورنمنٹ پاکستان نے کی، جنہوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں صنعت کاروں پر عوامی ذمہ داری سے انحراف، ٹیکسوں کی چوری، بد دیانتی، فریب کاری، سرمائے کو ملک سے باہر منتقل کرنے، دولت جمع کرنے کے لیے اندھے ہو جانے، اجارہ داریاں قائم کرنے اور عوامی مفاد سے بالکل بے پرواہ ہو جانے کے شدید الزامات عاید کیے اور کہا کہ اس سے کاروباری طبقے اور عام لوگوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ جناب اجمل علی چودھری وزیر صنعت نے فرمایا کہ تجارت اور صنعت کے اندر بدکرداری اس حد تک فروغ پا چکی ہے کہ یہ دونوں اب بدنامِ روزگار ہو چکے ہیں۔ قیمتوں میں اضافہ کرنا، پیداوار میں کمی کرنا، اور غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنا یہ وہ ہتھکنڈے ہیں جن سے ہر شخص اور خود حکومت بھی واقف ہے اور ان ہتھکنڈوں کے باعث صنعت کار ملک کی عام آبادی سے کٹ کر الگ ایک جزیرہ

بن چکے ہیں۔"

یہ باور کرانے کی ہمیشہ کوشش کی گئی ہے کہ سرمایہ دار ملک کے محسن ہیں اور خود سرمایہ دار تو اپنے آپ کو ملک اور قوم کے نجات دہندہ اور مالک تصوّر کرتے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ ملک پسماندہ تھا اور سرمایہ داروں نے سرمایہ لگا کر ملک کی ترقی میں بہت زیادہ حصّہ لیا ہے لیکن کیا یہ حقیقت ہے؟ اس سلسلے میں ملک کے ایک مشہور صنعت کار سیٹھ احمد داؤد کا انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پریس انٹرویو میں اخباری نمائندوں کے سوالات کے جوابات میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

سیٹھ داؤد کی پریس کانفرنس

سیٹھ احمد داؤد جب این۔ آئی۔ ٹی کے چیرمین مقرر ہوئے تو آپ نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس میں جو کچھ انھوں نے فرمایا اس کے ضروری نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ داؤد نے تسلیم کیا کہ اس کے پاس کوئی رقم کاروبار میں لگانے کے لیے نہیں تھی۔

۲۔ وہ فٹ پاتھ کا آدمی تھا۔

۳۔ پاکستان بنتے ہی "فضلِ ربّی" ہوا اور وہ حکومت کی نوازشات سے دیکھتے ہی دیکھتے بڑا صنعت کار بن گیا۔

۴۔ اب وہ ٹیکسٹائل کی صنعت کا بڑا ستون ہے۔

۵۔ کاغذ کا بادشاہ (PAPER KING) ہے۔ کرنافلی کا کاغذ کا کارخانہ

جو خود حکومت نے ساڑھے چھ کروڑ روپیہ صرف کر کے قائم کیا تھا اس کے ہاتھ فروخت کیا گیا ہے)۔

۶۔ بینکر ہے۔

۷۔ بیمہ کا بڑا کاروباری ہے۔

۸۔ آدھ درجن دوسری صنعتوں کا مالک ہے۔

۹۔ نیل کی صنعت کا بھی اجارہ دار ہو گا کیونکہ نیل کا بھی ٹھیکہ اسے دے دیا گیا ہے۔

۱۰۔ چٹاگانگ کے پاس ایک بڑا علاقہ جنگل اگانے اور جنگل سے متعلق صنعتیں قائم کرنے کے لیے بھی اس نے خریدا ہے۔

ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ کپڑے کی صنعت میں منافع کی شرح ۲۰۰ سے ۳۰۰ فیصد ہے۔

داؤد نے کہا ہاں، ہر فیکٹری کا منافع الگ الگ ہوتا ہے۔ پوچھا گیا کپڑے کی قیمتیں کیوں تیزی سے بڑھ رہی ہیں؟ جواب دیا گیا "میں نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ مشینری کے پرزوں کی درآمد کی وجہ سے ہوں"۔

ایک اخبار نویس نے پوچھا آپ اخباری صنعت کب شروع کر رہے ہیں؟ جواب میں سیٹھ داؤد نے کہا "ہرگز نہیں، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے"۔

(پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۸ء)

سیٹھ احمد داؤد آج کل مندرجہ ذیل کمپنیوں کے مالک ہیں:

۱۔ داؤد کارپوریشن لمیٹڈ

۲۔ داؤد انڈسٹریز لمیٹڈ

۳۔ داؤد کاٹنز لمیٹڈ

۴۔ بوریوالہ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۵۔ لارنس پور وولن اینڈ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۶۔ داؤد مائننز لمیٹڈ

۷۔ داؤد پٹرولیم لمیٹڈ

۸۔ داؤد ہرکولیس اینڈ فرٹیلائزرز لمیٹڈ

۹۔ سنٹرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۱۰۔ کرنافلی پیپر ملز لمیٹڈ

۱۱۔ کرنافلی ریان اینڈ کیمیکلز لمیٹڈ

۱۲۔ داؤد جیوٹ ملز لمیٹڈ وغیرہ وغیرہ۔

سرمایہ داروں اور حکمرانوں کا مشترک مفاد

ان بیس گھرانوں میں سے ایک محسنِ اعظم کے اس انٹرویو سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ گھرانے محض سرمایہ داری نظام کے پیدا کردہ ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو حکمرانوں کی چاپلوسی کے ماہر ہیں اور انھوں نے نُٹ پاتھ سے اُٹھ کر ایوانِ حکومت میں چاپلوسی سے نقب لگائی اور مُلک کی دولت کے بلاشرکتِ غیرے مالک بن کر بیٹھ گئے، ۲۰۰ سے ۳۰۰ فی صدی منافع حاصل کرنے، عام لوگوں کا خون چُوسنے، بیرونِ مُلک سرمایہ منتقل کرنے اور حکمرانوں کو رشوت کی چاٹ لگانے کے فن کے ماہر ہیں۔ کاغذ کے کارخانے پر قبضہ کر کے کاغذ کی قیمت کئی گنا بڑھا دی ہے اور حکومت اپنی جگہ خوش ہے کہ ان کے اس طرح

رویّہ سے آزادانہ اخبار نویسی خود بخود دم توڑ گئی ہے۔ حکومت بھی خوش ہے اور سیٹھ داؤد بھی اور اس دوطرفہ اتحاد کے نتائج سامنے ہیں۔

منافع خوری پاکستان میں صنعت کاروں نے منافع خوری کے تمام ریکارڈ مات کر دیے ہیں اور غضب یہ ہے کہ اس پالیسی میں کسی طرح کا کوئی تغیر کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ اس منافع خوری کی سرپرستی کی گئی ہے اور وہ تمام اقدامات کیے جاتے ہیں جن سے منافع کسی طرح گرنے نہ پائے۔ چند کمپنیوں کے چند سالوں کے منافع یہاں دیے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ وہ منافع ہے جو انکم ٹیکس کے لیے تیار شدہ حساب میں دیا گیا ہے اور اصل منافع اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ تیار شدہ مال کا بڑا حصّہ تو ویسے ہی مارکیٹ میں چلا جاتا ہے اور کہیں درج ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ کالا روپیہ ہے جس سے جائدادیں خریدی جاتی ہیں اور رشوت کے طور پر کام آتا ہے۔

۱۔ ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ سال ۱۹۵۳ء

کل پیداوار : ۲ کروڑ ۸۶ لاکھ ۱۹ ہزار ۷۳۱ گز کپڑا

منافع سالانہ : ۱ کروڑ ۱۵ لاکھ روپیہ

(نوائے وقت ۱۰ مارچ ۱۹۵۴ء)

منافع کی شرح اس طرح آٹھ آنے فی گز کے قریب ہے اور صرف ایک سال میں مل کی قیمت وصول کر لی گئی ہے۔

۲۔ سال سنہ ۱۹۵۷ء

کریسنٹ مل: ۲/۳ ۱۶۶ فی صدی منافع

مقبول اینڈ کو : ۷٫۱۷ فی صدی منافع

۳۔ سال سنہ ۱۹۵۸ء

کریسینٹ مل : ۱۲۹٫۹۷ فی صدی

کالونی مل : ۶۸ فی صدی

مقبول اینڈ کو : ۸۰٫۲۵ فی صدی

۴۔ سال سنہ ۱۹۶۰ء

ولیکا : ۶۸٫۲ فی صدی

۵۔ سال سنہ ۱۹۶۲ء

کالونی مل : ۶۷٫۶۵ فی صدی

ولیکا : ۶۶٫۷۴ فی صدی

۶۔ سال سنہ ۱۹۶۸ء (یکم مئی سے ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء)

آر۔ آر۔ ٹیکسٹائل ملز (چیئرمین زیڈ۔ اے۔ بھوانی)

برآمد میں اضافہ : ۱۶۶ فی صدی

فروخت میں اضافہ : ۸۴ ״

منافع میں اضافہ : ۱۲۰ ״

چھ ماہ کا منافع : ۱۵ لاکھ ۶۵ ہزار

تعداد پتلیاں SPINDLES ۱۱ ہزار ۵۰۰ (پاکستان ٹائمز ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

۷۔ گندھارا انڈسٹریز

سنہ ۱۹۵۹ء : ۵۱ لاکھ ۵۵ ہزار منافع

۱۹۶۰ء : ۹۰ لاکھ ۶۱ ہزار منافع

۱۹۶۱ء : ۹۵ لاکھ ۵۳ ہزار منافع

۱۹۶۲ء : ۵۲ لاکھ روپے میں فروخت ہوگئی۔

۱۹۶۶ء : ۸۰ لاکھ ۳۴ ہزار ۲۷۳ روپے منافع

۱۹۶۷ء : ۱ کروڑ ۶۲ ہزار روپے منافع

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مینجنگ ایجنسی کا منافع، مینجنگ ڈائرکٹروں اور ڈائرکٹروں کی تنخواہیں اور بونس وغیرہ ادا کرنے کے بعد یہ رقم خالص منافع کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ مالکانِ مل مینجنگ ڈائرکٹر ہونے کی حیثیت میں جو بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتے ہیں وہ بالکل الگ ہیں۔ کمپنی کی قیمت ۵۲ لاکھ اور منافع ایک کروڑ صرف ایک سال میں، صرف یہی بات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پاکستان سرمایہ داروں کی چراگاہ ہے۔

منافع خوری اور قیمتوں میں اضافے پر مسٹر حسنی کی رائے

اسٹیٹ بنک کے سابق گورنر جناب ایس اے حسنی مرحوم نے ستمبر ۱۹۶۶ء میں اسٹیٹ بنک کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی اس میں پاکستان میں صنعتی ترقی اور صنعت کاروں کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

"پاکستان میں صنعتی ترقی بہت بڑے سرکاری چھتر کے سائے میں ہو رہی ہے اور صنعت کاروں کو ہر حالت میں منافع کی گارنٹی بھی

دی جاتی ہے اور کنٹرول کے ذریعہ پابند مارکیٹ بھی مہیا کی جاتی ہے۔ قیمتوں کے مقرر کرنے کے سلسلہ میں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی اور جن اشیاء کو یہ لوگ تیار کرتے ہیں ان اشیاء کی درآمد روک کر انھیں ایسی مارکیٹ مہیا کر دی جاتی ہے جہاں ان کو کوئی مقابلہ بھی نہیں کرنا پڑتا اور لاگت کی پروا کیے بغیر وہ جو جی چاہے قیمتیں مقرر کرتے رہتے ہیں۔ اصل لاگت کا وہ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے اور من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس فضا میں یہاں صنعتی ترقی ہو رہی ہے" (پاکستان ٹائمز ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء)

نتائج

اس سرکاری سرپرستی اور لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی مل جانے کے نتیجے میں ہر صنعت کار ایک مل سے صرف ایک سال میں حاصل شدہ منافع سے دوسری مل قائم کرنے کا پروگرام بناتا ہے اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچتا ہے کہ تمام صنعتی ترقی صرف گنتی کے خاندانوں کی اجارہ داری بن چکی ہے اور یہ اجارہ داری جو رنگ لا رہی ہے وہ راز اب طشت ازبام ہو چکا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند صنعت کاروں کی ملوں کے کوائف دیے جا رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ہماری صنعتی ترقی اندھے کی ریوڑیاں ہیں جو صرف اپنے ہی گھر میں بانٹی جا رہی ہیں:

چند صنعت کاروں کی مثالیں

ایک صنعت کار جناب کے محمد منیر صاحب ہیں۔ یہ صاحب

جن کمپنیوں کے حصّہ دار ہیں وہ درج ذیل ہیں:

چیئرمین:

۱۔ بیک ٹرکس لمیٹڈ

۲۔ حئی سنز لمیٹڈ

مینیجنگ ڈائریکٹر:

۱۔ حئی سنز انڈسٹریل کارپوریشن

۲۔ ٹوبیکو انٹرنیشنل لمیٹڈ

۳۔ پاکستان الیکٹرک فٹنگز مینوفیکچررز لمیٹڈ

ڈائریکٹر:

۱۔ حئی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

۲۔ الیکٹرک لیمپ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

۳۔ حئی سنز سٹیل ملز لمیٹڈ

۴۔ یونین کولڈ سٹوریج لمیٹڈ

۵۔ یونائیٹڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۶۔ امیلگیمیٹڈ مائنز لمیٹڈ

۷۔ ڈویلپمنٹ کنسٹرکشن کارپوریشن لمیٹڈ

۸۔ یونین فشریز لمیٹڈ

۹۔ نیشنل سٹیل آف پاکستان لمیٹڈ

۱۰۔ حئی سنز شوگر ملز لمیٹڈ

۱۱۔ جی سنز کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ

۱۲۔ ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۱۳۔ ایسٹرن ریفائنری لمیٹڈ

۱۴۔ برما آئل ملز لمیٹڈ

۱۵۔ پاکستان ایگزیبیشن کارپوریشن لمیٹڈ

۱۶۔ میرپور خاص شوگر ملز لمیٹڈ

۱۷۔ آدم جی شوگر ملز لمیٹڈ

۱۸۔ آدم جی انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۱۹۔ جنرل انوسٹمنٹس لمیٹڈ

۲۰۔ جی سنز کمرشل اینڈ انڈسٹریل کارپوریشن لمیٹڈ وغیرہ وغیرہ

ایک صنعت کار جناب جنرل حبیب اللہ صاحب ہیں۔ انھیں اس میدان میں آئے ہوئے ابھی صرف ۶ - ۷ سال ہوئے ہیں پہلے فوج میں جرنیل تھے اور اس لائن کا کوئی خاص تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ صرف چند سال میں ان کی پھیلاؤ ملاحظہ ہو:

چیئرمین:

۱۔ گندھارا انڈسٹریز لمیٹڈ

۲۔ جنانہ ڈی ملوچہ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۳۔ گوہر حبیب لمیٹڈ

۴۔ اٹلس آٹوز لمیٹڈ

۵۔ گلفر اجیب لمیٹڈ

۶۔ بیبیوجی سروسز لمیٹڈ

۷۔ اٹلس ای پاک لمیٹڈ

۸۔ ایم کے فونڈری انجنیئرنگ ورکس لمیٹڈ

۹۔ اٹلس بیٹریز لمیٹڈ

۱۰۔ بنوں وولن ملز لمیٹڈ

۱۱۔ پریمیر انجنیئرز لمیٹڈ

۱۲۔ یونیورسل لائف انشورنس لمیٹڈ

وائس چیرمین :

۱۔ گندھارا منرل (MINERAL) اینڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ

۲۔ گیمین (پاکستان لمیٹڈ)

ڈائریکٹر :

۱۔ اسٹیٹ بنک لمیٹڈ

۲۔ میک بیوریجز لمیٹڈ

ایک اور صنعت کار جناب ایم۔ اے رنگون والا ہیں۔ یہ صاحب ان کمپنیوں کے مالک ہیں :

چیئرمین :

۱۔ برما آئل ملز لمیٹڈ

۲۔ پاکستان پیپر پروڈکٹس لمیٹڈ

پریذیڈنٹ :

۱۔ نیشنل بنک آف پاکستان

ڈائریکٹر :

۱۔ ڈاج اینڈ سیمور انڈسٹریز لمیٹڈ

۲۔ پاکستان امریکن لبرٹی لمیٹڈ

۳۔ نیک ٹرمینل لمیٹڈ

۴۔ پاکستان انڈسٹریل اینڈ کریڈٹ انوسٹمنٹ لمیٹڈ

۵۔ کراچی گیس کمپنی لمیٹڈ

۶۔ پریمیر انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۷۔ سنٹرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۸۔ فیروز سنز لیبارٹریز لمیٹڈ

۹۔ نیشنل سٹیل آف پاکستان لمیٹڈ

۱۰۔ پاک نیشنل آئلز لمیٹڈ

۱۱۔ نیشنل ریفائنری لمیٹڈ

۱۲۔ پاکستان سروسز لمیٹڈ

۱۳۔ پاکستان ایکسپلوریشن کارپوریشن لمیٹڈ

۱۴۔ ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ

۱۵۔ ایم۔ ایف۔ ایم۔ وائی انڈس لمیٹڈ

۱۶۔ کریسنٹ جیوٹ پروڈکٹس لمیٹڈ

۱۷۔ محمد علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۸۔ زنگون والا لمیٹڈ وغیرہ وغیرہ

ایک صاحب جناب اے۔ کے خان چٹاگانگ کے ہیں۔ آپ ان کمپنیوں کے چیئرمین ہیں:

چیئرمین:

۱۔ اے۔ کے خان اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۲۔ چاٹگام ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۳۔ اے۔ کے۔ خان پلائی ووڈ کمپنی لمیٹڈ

۴۔ پاکستان سٹیم نیوی گیشن لمیٹڈ

۵۔ اے۔ کے خان جیوٹ کمپنی لمیٹڈ

۶۔ اے۔ کے ڈاکنگ اینڈ انجنیئرنگ کمپنی لمیٹڈ

۷۔ اے۔ کے لمیٹڈ

۸۔ دی لیک سائڈ ٹمبر انڈسٹریز لمیٹڈ

۹۔ خان ایلین کارپوریشن لمیٹڈ

۱۰۔ ایسٹرن انشورنس کمپنی لمیٹڈ

جناب ایم۔ آر۔ صدیقی بھی چٹاگانگ کے صنعت کار ہیں۔ ان کا تصرف درج ذیل کمپنیوں پر ہے:

چیئرمین:

۱۔ ڈان برادرز لمیٹڈ

۲۔ پاکستان انشورنس کمپنی لمیٹڈ

منیجنگ ڈائرکٹر:

۱۔ ایسٹرن انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۲۔ نیشنل موٹرز لمیٹڈ

۳۔ کریسنٹ موٹرز لمیٹڈ

ڈائرکٹر:

۱۔ پاکستانی شپنگ لائنز لمیٹڈ

۲۔ پاکستان انشورنس کارپوریشن

۳۔ چاٹگام بورڈ ملز لمیٹڈ

۴۔ نیشنل آئرن اینڈ سٹیل انڈسٹریز لمیٹڈ

۵۔ ایسٹرن مرکنٹائل بنک لمیٹڈ

۶۔ پاکستان سٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ

۷۔ اے۔ کے خان اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۸۔ چاٹگام ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

۹۔ اے۔ کے خان پلائی ووڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۰۔ اے۔ کے۔ ڈاکنگ اینڈ انجنیئرنگ کمپنی لمیٹڈ

۱۱۔ اے۔ کے خان جیوٹ کمپنی لمیٹڈ

۱۲۔ لیک سائڈ ٹمبر انڈسٹریز لمیٹڈ

۱۳۔ خان۔ ایلن کارپوریشن

۱۴۔ کھلنا نیوز پرنٹ ملز لمیٹڈ

امیر علی ۔ ایچ ۔ فینسی ۔ میکلوڈ روڈ ۔ کراچی

چیئرمین:

۱۔ کامرس بنک لمیٹڈ

۲۔ پاکستان ریفائنری لمیٹڈ

۳۔ اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ

۴۔ نیو جوبلی انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۵۔ انڈسٹریل مینجمنٹس لمیٹڈ

۶۔ پاکستان کروم مائنز لمیٹڈ

۷۔ فینسی انوسٹمنٹس لمیٹڈ

۸۔ فینسی فونڈیشن

۹۔ پیلز جیوٹ ملز لمیٹڈ

۱۰۔ فینسی ٹرسٹیز لمیٹڈ

۱۱۔ کریسنٹ جیوٹ ملز کمپنی لمیٹڈ

۱۲۔ پلاٹینم جوبلی فائننس اینڈ انوسٹمنٹس کارپوریشن لمیٹڈ

۱۳۔ پاک اسماعیلیہ پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۴۔ انڈسٹریل پروموشن سروسز آف پاکستان لمیٹڈ

ڈائرکٹر: ۱۵۔ سوئی گیس ٹرانسمشن کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ کراچی گیس کمپنی لمیٹڈ

۱۷- ذیل پاک سیمنٹ کمپنی لمیٹڈ

۱۸- پک اپ لمیٹڈ

۱۹- کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن لمیٹڈ

۲۰- لانڈھی انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹس لمیٹڈ

۲۱- پاکستان انشورنس کارپوریشن

۲۲- پاکستان سروسز لمیٹڈ

۲۳- میرپور خاص شوگر ملز لمیٹڈ

۲۴- انڈسٹریل کارپوریشن لمیٹڈ

۲۵- موٹر کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ

۲۶- پاکستان ہاؤس انٹرنیشنل لمیٹڈ

۲۷- گل اینڈ کمپنی لمیٹڈ

نواب خواجہ حسن عسکری - نواب آف ڈھاکہ

چیئرمین :

۱- بنگال لائف اینڈ جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

وائس چیئرمین :

۲- پاکستان جیوٹ اینڈ گینز ایکسچینج لمیٹڈ

مینجنگ ڈائرکٹر :

۳- نواب عسکری جیوٹ ملز

ڈائرکٹر : ۴- پاک بے کمپنی لمیٹڈ

۵- جیسور جیوٹ انڈسٹریز لمیٹڈ

۶- انٹرنیشنل جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

۷- ایسٹرن بنکنگ کارپوریشن لمیٹڈ

۸- ایسٹرن کیمیکلز لمیٹڈ

۹- پی۔ آئی۔ اے کارپوریشن

۱۰- انڈسٹریل پروموشن سروسز پاکستان لمیٹڈ

یہ کوائف چند کارخانہ داروں کے ہیں۔ ایک بہت بڑا طبقہ ان سابق وزیروں کا ہے جو زمیندار بھی ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور کسی نہ کسی طرح سرکاری اثر و رسوخ بھی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر سر ظفر اللہ خاں کی سرپرستی میں شاہنواز لمیٹڈ اور دوسرے ادارے پرورش پاتے رہے۔ جناب سید امجد علی صاحب مجلس اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی اور کاروبار ساتھ ساتھ کرتے رہے اور علی آٹو موبائلز اور ایکسچینج لمیٹڈ ان ہی کی چشم کرم کے رہین منت ہیں۔ ایسے سینکڑوں ادارے موجود ہیں جو محض سرکاری اثر و رسوخ کی پیداوار ہیں اور خوب ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ بعض پرانے سیاست دانوں کو نئے دور میں جو مراعات حاصل ہوئی ہیں ان کا وہ اپنے دور حکومت میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مثلاً ملک فیروز خاں نون اپنے زمانہ عروج میں صرف وزیر اعظم تھے اور بڑے زمیندار تھے۔ اب وہ نون شوگر مل کے بھی مالک ہیں اور صنعت کار بھی ہیں۔

بائیس گھرانے

بائیس گھرانوں کا معاملہ تو اب پاکستان میں افسانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ان میں کوہ نور گروپ ہے جو سہگل حضرات

کی جاگیر ہے۔ داؤد گروپ ہے جو تاجروں کے بادشاہ ہیں اور رفٹ ہاتھ سے اُٹھ کر بغیر ایک پیسہ لگائے محض سرکار کے الہ دین کے چراغ کی بدولت یہاں تک پہنچے ہیں، بھوانی گروپ ہے، آدم جی گروپ ہے اور دُوسرے حضرات ہیں۔ پورے مُلک کی اسی فیصدی دولت پر یہ قابض ہیں۔ بقیہ پندرہ فی صدی پر چند ہزار مراعات یافتہ لوگ قابض ہیں اور بڑے ہی محتاط اندازے کے مطابق ۱۱ کروڑ عوام صرف پانچ فیصدی پر جی رہے ہیں۔

سرمایہ داروں کی گرفت

مُلک کی معیشت اور سیاسی نظام پر سرمایہ داروں کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وُہ جب چاہیں مُلک میں سیاسی اور معاشی بحران پیدا کر سکتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں مِل مالکوں نے مُلک کے اندر چینی کی قیمت بڑھانے کے لیے بحران پیدا کر دیا اور پورے ملک کو پریشان کر دیا۔ حکومت کی تمام قوّت ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر اس حد تک مجبور ہو گئی کہ جو چینی باہر سے درآمد کی گئی اسے خود حکومت کا اپنا ادارہ ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان جائز نرخوں پر فروخت نہ کر سکا اور منافع خوری کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ چنانچہ نوابزادہ عبدالغفور ہوتی وزیرِ تجارت نے ۱۴ مئی ۱۹۶۸ء کو قومی اسمبلی کو بتایا کہ جو چینی درآمد کی جا رہی ہے اس کی قیمت کراچی پہنچ کر ۲۸ پونڈ ۱۳ شلنگ فی ٹن ہے یعنی کم و بیش گیارہ بارہ روپے من، اور اسے کراچی ہی میں ۷۵ روپے من کے حساب سے فروخت کیا گیا۔

چینی کا بحران اور حکومت کا طرزِ عمل

چینی کے بحران پر ایک سوال کا جواب دیتے

ہوئے وزیرِ تجارت کی طرف سے قومی اسمبلی کو بتایا گیا کہ یہ بحران ۵ گھرانوں نے پیدا کیا تھا۔ ان میں آدم جی، بھوانی، کریسنٹ ملز، حاجی ہاشم، حاجی احمد اور محمد امین محمد بشیر کے نام بھی گنوائے گئے۔

(کارروائی قومی اسمبلی سرمائی اجلاس منعقدہ ڈھاکہ بحوالہ پاکستان آبزرور مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۸ء)

یہ بالکل صاف الفاظ میں حکومت کا اعتراف ہے کہ یہ گھرانے جب اور جیسے چاہیں ملک کے اندر ہر قسم کا معاشی بحران پیدا کر سکتے ہیں اور ان کے مفاد پر پوری قوم کا مفاد قربان کیا جا سکتا ہے۔

چینی کے بحران پر مغربی پاکستان اسمبلی کے سرمائی اجلاس ۱۹۶۸ء میں جو بحث ہوئی تھی اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ یہ بحران حکومت کے افسروں اور مل مالکان نے مل کر عوام کو لوٹنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ جب چینی مارکیٹ سے غائب کر کے اس کی بلیک شروع کی گئی تو بجائے اس بات کے کہ حکومت اپنا ریزرو سٹاک مارکیٹ میں لا کر قیمت کو بڑھنے سے روکتی صوبائی حکومت نے اپنا سارا ریزرو سٹاک مل مالکان کو واپس دے دیا اور اس طرح مل مالکان نے ۸۵ لاکھ روپیہ اس سٹاک سے منافع کمایا۔ ملک خدا بخش بچہ صاحب نے اس امر کی تحقیقات کرنے کا وعدہ فرمایا تھا کہ یہ سٹاک کیسے مل مالکان کو دے دیا گیا۔ لیکن یہ تحقیقات تو وہ کرائے جس کا اپنا دامن پاک ہو۔ حکومت نے اس بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی کرنے کے بعد کنٹرول قیمت بھی پونے دو روپے سیر کر دی اور اس طرح مستقل لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دے دیا۔

دلچسپ تضاد

تجارت کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جب پیداوار کم ہو تو قیمت زیادہ ہوتی ہے اور جب پیداوار میں اضافہ ہو جائے تو قیمتیں گر جاتی ہیں لیکن پاکستان کی مارکیٹ اس دُنیا بھر کے مسلّمہ اصول کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں جُوں جُوں پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے منافع خوری میں اضافے کی وجہ سے قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ۵۰-۱۹۴۹ء میں جب چینی کی کل پیداوار ۷۷، ۲۹۱ ٹن تھی اور ایک لاکھ ۳ ہزار ۸ سو ۵۴ ٹن باہر سے درآمد کرنا پڑتی تھی تو پرچون قیمتِ فروخت ایک روپیہ دو آنے سیر تھی اور جب ۶۷-۱۹۶۶ء میں چینی کی پیداوار بڑھتے بڑھتے ۴ لاکھ ۳۱ ہزار ۶۷۶ ٹن ہو گئی ہے تو اب چینی ۲، ۱/۴ ۲ روپے سیر ہے اور حکومت خود پونے دو روپے سیر بڑی نوازش سے کنٹرول ریٹ پر مہیّا کر رہی ہے۔

یہی حال دُوسری مصنوعات کا ہے۔ جب مُلک کے اندر ۱۹۵۰ء میں سوتی کپڑا صرف ۱۰ کروڑ ۶۳ لاکھ گز تیار ہو رہا تھا تو، سوتی کپڑا ایک روپے گز مل جاتا تھا۔ اب جبکہ ۱۹۶۶ء تک پہنچتے پہنچتے مُلک میں ۷۰ کروڑ ۴۰ لاکھ گز سُوتی کپڑا تیار ہونے لگا ہے تو وُہی کپڑا جو ایک روپے گز مل سکتا تھا اب تین ساڑھے تین روپے گز ملتا ہے۔

جب ۱۹۵۴ء تک ہم کاغذ تیار نہیں کر رہے تھے اور باہر سے درآمد کرتے تھے تو اخبارات کی قیمت صرف ایک آنہ تھی، عام بچّوں کی لکھنے کی کاپیاں چار چار آنے میں ملتی تھیں اب جبکہ ۱۹۶۶ء تک ہم نے ۷۰ ہزار ٹن کاغذ مُلک کے اندر تیار کرنا شروع کر دیا ہے تو اخبار کی قیمت تین گُنا اور کاپیوں کی چار گُنا بڑھ چکی ہے۔

یہی حال پٹ سن کی مصنوعات، سیمنٹ، بناسپتی گھی، شوٹ، سائیکلوں، سلائی کی مشینوں، ربڑ کے ٹائر وں ٹیوبوں اور دُوسری اشیا کا ہے۔

ہماری صنعتی ترقی

ہماری صنعتی ترقیات کا ماحصل یہ ہے کہ مُلک کے چند ہزار لوگوں کو ترقی اور صنعت کے نام پر عام لوگوں کو لُوٹنے کا لائسنس ملا ہُوا ہے اور وُہ حکومت کی سرپرستی اور حفاظت میں کروڑوں لوگوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو دن دہاڑے لُوٹتے بھی ہیں اور انھیں گھُورتے بھی ہیں ایک عام شہری کے لیے یہ ترقی عذاب ہے جس سے چھٹکارا پانے کی بظاہر کوئی صُورت نظر نہیں آتی جب تک اس سرمایہ دارانہ نظام سے چھٹکارا نہ ہو۔

صنعتی پالیسی

ہمارے مُلک میں صنعتی پالیسی یہ ہے کہ حکومت جس شخص پر کسی وجہ سے مہربان ہو جائے اسے کوئی مِل لگانے کا پرمٹ مِل جاتا ہے۔ وُہ چاہے تو پرمٹ کسی سرمایہ دار کے پاس نقد دس بیس لاکھ روپے میں فروخت کر دے اور چاہے تو کسی بنک سے قرض لے کر کچھ زمین خرید کر مِل کی عمارت کھڑی کر دے اس کے بعد حکومت غیر ممالک سے قرض لے کر ایک پیسہ وصول کیے بغیر پُوری مشینری منگوا دیتی ہے جسے نصب کرنے کے بعد کام شروع ہو جاتا ہے اور تین سال سے چھ سال تک تمام ٹیکس معاف ہوتے ہیں۔ ——

—— اور لوگوں کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ ان مصنوعات کو ہر قیمت پر خریدیں۔ شریف صنعت کار دو تین سو فیصدی تک منافع وصول کر کے صرف ایک سال میں بنک کا قرض بھی ادا کر دیتے ہیں اور کروڑ پتی بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور تیسرے سال تک پہنچتے پہنچتے ایک مِل اور لگا لیتے ہیں اور پھر اس دُوسری

مِل پر ٹیکس معاف ہونے کی وجہ سے پہلی مِل کا بہت سا مال بھی دُوسری مِل کی پیداوار کے طور پر بغیر ٹیکس ادا کیے نکالتے چلے جاتے ہیں اَور اُس وقت تک یہ چکّر چلتا رہتا ہے جب تک بارہ ملیں نہیں بن جاتیں مصنوعات کی قیمتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک خاندان ارب پتی ہو جاتا ہے اَور غیر ممالک سے لیا ہُوا قرض پُوری قوم پر لد جاتا ہے۔ سرمایہ دار اس قرض کو مُلکی کرنسی میں قسطوں میں ادا کرتے ہیں اور قوم کروڑوں روپے سُود ادا کرتی رہتی ہے، اور ترقیات کے افسانے سُنتی رہتی ہے۔

شیطانی چکّر

دولت کی نامنصفانہ تقسیم کے شیطانی چکّر پر اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اصل خرابی کی جڑ نظامِ حکومت میں ہے، جہاں سے دولت پیدا کرنے کے وسائل مہیّا کیے جاتے ہیں اور اسلام کے عادلانہ نظامِ معیشت کو نظر انداز کر کے تمام وسائل کو چند لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا ہے۔ ان ہاتھوں سے وسائل کو واپس لینے اور عادلانہ طریق سے تقسیم کرنے کی ذمّہ داری بھی حکومت ہی کی ہے۔

دولت کی نامنصفانہ تقسیم سے جو اضطراب۔ عام لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے اس کا احساس اب حکمرانوں اَور اُن کے ساتھی سرمایہ داروں کو بھی ہونے لگا ہے، اور اس سلسلہ میں بعض نعروں کا سہارا لے کر لوگوں کو مزید کچھ عرصے کے لیے گمراہ کرنے کی جدوجہد کی جا رہی ہے۔ ان نعروں اور سکیموں میں اوّل نمبر خاندانی منصوبہ بندی کا ہے جو عام لوگوں کی توجّہ سرمایہ داروں کی طرف سے ہٹانے کی ایک ناپسندیدہ کوشش ہے یہی وجہ ہے کہ کروڑوں روپے صرف پبلسٹی پر خرچ کیے جا رہے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ان کی غربت بچّوں کی پیدائش کی وجہ

سے ہے ورنہ دولت تو سب کو برابر تقسیم ہو رہی ہے۔ دوسرا نعرہ سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کا ہے جس کا مقصد لوگوں کو ایک نئے گرداب میں پھنسا دینا ہے۔

○

باب ششم

اسلام آباد کی تعمیر

پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد ہے اور اسلام آباد کی صورتِ حال کو سمجھ لینے سے حکومت کی تمام پالیسی بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور یہ پالیسی افسر شاہی ہے۔

تعمیری اسکیم

دوسرے اور تیسرے پنجسالہ منصوبے میں اسلام آباد کے دارالحکومت کی تعمیر کے لیے ۲۰۷ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اور اب تک ۵۸ کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔

(کارروائی قومی اسمبلی ۱۶ر جون ۱۹۶۸ء)

۲۔ اب تک کل ۵۱،۲۱۹ ایکڑ زمین حکومت نے اسلام آباد کی تعمیر کے لیے لوگوں سے لی ہے۔"

(کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۷ار مئی ۱۹۶۸ء)

۳۔ اسلام آباد کے علاقے میں زمین کے اصل مالکوں کو اوسطاً ۲۱۸ روپے فی ایکڑ کے حساب سے قیمت ادا کی گئی ہے۔ اس میں مکانات اور ملبہ کی قیمت بھی شامل ہے۔

نوٹ:۔ اسلام آباد میں جو پلاٹ اس وقت فروخت ہو رہے ہیں ان کی قیمت کا اندازہ ۵۰ ہزار روپے فی ایکڑ ہے۔

(کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۲۲ر مئی ۱۹۶۵ء)

(۴) اسلام آباد میں جن لوگوں نے مکانات بنائے ہیں اور وہ کرائے پر لیے گئے ہیں ان سے کرایہ کی آمدنی پر انکم ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا، کیونکہ حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ جون ۱۹۷۰ء تک جو لوگ اسلام آباد میں کوٹھیاں تعمیر کریں گے ان کوٹھیوں کے کرایہ کی آمدنی ۵ سال تک انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ یہ پانچ سال کا عرصہ مکان کی تعمیر کے مکمل ہو جانے کی تاریخ سے شروع ہوگا۔

(۵) اسلام آباد میں کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے بہترین ترقی یافتہ قسم کی سہولتیں مثلاً مواصلات، پانی، گیس اور بجلی مہیا کی ہیں تاکہ صنعتیں قائم کی جاسکیں۔ جہاں تک مکانات کا تعلق ہے۔ جو لوگ جون ۱۹۷۰ء تک یہاں عمارات تعمیر کریں گے انہیں پانچ سال تک پراپرٹی ٹیکس معاف کر دیا گیا ہے اور کرایہ کی شکل میں جو آمدنی ان لوگوں کو ہوگی اس پر پانچ سال تک انکم ٹیکس بھی معاف کر دیا گیا ہے"

"یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مکانات، کوٹھیاں وغیرہ سرکاری افسروں کے لیے حکومت تعمیر نہیں کرے گی بلکہ جو لوگ مکانات تعمیر کر رہے ہیں ان سے مکانات اور کوٹھیاں کرایہ پر لی جائیں گی اور سرکاری افسروں کو رہائش کے لیے دی جائیں گی"

(کارروائی قومی اسمبلی مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۶۸ء)

(۶) ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے لیے کرائے پر بنگلے: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اسلام آباد کے چار بنگلے کرایہ پر لے رکھے ہیں اور ان کا ماہوار کرایہ ۵۱۰۰/- روپیہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان بنگلوں اور کرایہ کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

نمبر	مالک	ماہوار	پیشگی
(ا) G۶۶۴I	مسز امت القدیر	۱۴۰۰/-	۵۱۰۳/۲۵ روپے
(ب) ۶۶۵	عبدالوحید، سیٹلمنٹ آفیسر سی، ڈی، اے	۱۴۰۰/-	۵۱۰۳/۲۵ ؍؍
(ج) ۶۶۸	مختار عزیز سپرنٹنڈنٹ سی، ڈی، اے	۱۰۰۰/-	۶۰۰۰/- ؍؍
(د) ۶۹۲	مسز نیر ناز صادق	۱۳۰۰/-	۷۸۰۰/- ؍؍

افسروں کے بنگلے

اسلام آباد میں سرکاری افسروں بشمول فوجی افسروں نے جو بنگلے تعمیر کئے ہیں ان کی تعداد ۱۸۲ ہے۔

جن افسروں اور سرکاری ملازمین نے بنگلے تعمیر کیے ہیں ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ کا ریکارڈ نہیں رکھا گیا۔

سی ڈی اے[ئ] کے جن ملازمین نے بنگلے تعمیر کئے ہیں، ان کی تعداد ۳۳ ہے، ان کی فہرست پیش کی جا رہی ہے اور ان کی تنخواہیں بھی درج کی جا رہی ہیں:

نمبر شمار	نام	موجودہ ماہوار تنخواہ مع سپیشل تنخواہ
۱۔	محمد اکرم خاں	۸۸۴/۲۵ روپے
۲۔	فرید عباس صدیقی	۶۰۵/- ؍؍

ئ: کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی

نمبر شمار	نام ملازم	موجودہ ماہوار تنخواہیں
۳-	شیخ کریم داد	۱۰۱۷/۵۰ روپے
۴-	نور احمد	۴۹۰/- ″
۵-	نصیر احمد	۴۹۰/- ″
۶-	برکت علی	۶۰۵/- ″
۷-	محمد بخش	۵۷۷/- ″
۸-	محمد اشرف	۱۳۰/- ″
۹-	اے۔رشید	۶۳۰/- ″
۱۰-	شوکت یوسف	۲۵۸۰/- ″
۱۱-	اے۔آر جاوید	۱۳۰۰/- ″
۱۲-	سرفراز خاں	۱۳۷۵/- ″
۱۳-	رضوان الحسن	۱۰۸۰/- ″
۱۴-	زیڈ۔آئی سلیم	۸۲۵/- ″
۱۵-	محمد رفیق	۱۰۰۰/- ″
۱۶-	ایم۔ایچ حیدری	۲۱۰۰/- ″
۱۷-	محمد اختر	۴۷۶/- ″
۱۸-	حاجی محمد شریف	۵۵۲/- ″
۱۹-	وزیر علی شیخ	۱۱۰/- ″
۲۰-	اے۔رشید	۶۴۸/- ″

نمبر شمار	نام ملازم	موجودہ ماہوار تنخواہ مع سپیشل تنخواہ
۲۱-	ایم۔ آر نسیم	۵۵۰/- روپے
۲۲-	نفیس احمد	۴۰۰/- 〃
۲۳-	احسان الٰہی	۶۲۴/- 〃
۲۴-	محمد اسلم قریشی	۶۲۵/- 〃
۲۵-	توحید راؤ	۴۵۵/- 〃
۲۶-	محمد رمضان بھٹی	۱۸۵/- 〃
۲۷-	ملک خالد محمود	۵۵۰/- 〃
۲۸-	عبد الحمید	۲۳۰۰/- 〃
۲۹-	ڈاکٹر مسنر ایم حسین	۱۰۰۰/- 〃
۳۰-	ملک اسرار الحق	۱۴۵۰/- 〃
۳۱-	سید وزیر الدین	۱۷۲۷/- 〃
۳۲-	نذیر حسین شیخ	۴۷۳/- 〃
۳۳-	اے۔ ایچ قریشی	۳۶۲/- 〃

(کارروائی قومی اسمبلی ۲۷ مئی ۱۹۶۸ء)

مسجد اور سینما

"اسلام آباد میں میلوڈی سینما کی تعمیر پر حکومت نے ۲۱ لاکھ ۸۷ ہزار روپیہ صرف کیا۔ اب اس سینما کو میسرز فاروق اینڈ خادر لمٹیڈ کراچی کے ہاتھ فروخت کر دیا

گیا ہے ؛؛

"اسلام آباد میں کل پانچ مساجد تعمیر ہوئی ہیں اور ان پر کل خرچ ۱۳ لاکھ ۵۳ ہزار روپیہ ہُوا ہے ؛؛

(کارروائی قومی اسمبلی ۵ رجون ۱۹۶۵ء)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

● جو لوگ کئی پشتوں سے اس علاقے میں زمینوں اور مکانوں کے مالک چلے آ رہے تھے ان سے زمینیں اور مکانات لے لیے گئے اور اوسطاً ۲۱۸ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے قیمت ادا کی گئی ۔ اس قیمت میں مکانات کا ملبہ وغیرہ بھی شامل ہے اور سادہ زمینیں بھی ، باغات بھی اور قابلِ کاشت اراضی بھی ۔

● یہ زمینیں پلاٹ بنا کر فروخت کی گئیں اور قیمت فروخت کا اندازہ ۵۰ ہزار روپیہ فی ایکڑ ہے ۔

● ۱۸۲ سرکاری افسروں نے مکانات تعمیر کئے ہیں ۔

● ان سرکاری افسروں کی تنخواہیں کیا ہیں ؛ یہ حکومت نہیں بتا سکی ۔

● سی ڈی اے کے ملازمین جنہوں نے مکانات تعمیر کیے ہیں ، ان کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سپیشل تنخواہ سمیت ان کی موجودہ تنخواہ اوسطاً چار پانچ سو روپیہ ماہوار ہے اور اس تنخواہ میں ہی وہ کوٹھیاں تعمیر کر لینے کے قابل ہو گئے ہیں

● حکومت نے اب یہ پالیسی بنائی ہے کہ خود سرکاری طور پر کوٹھیاں تعمیر نہ کی جائیں بلکہ ان افسروں کی کوٹھیاں کرائے پر لی جائیں ۔

● کوٹھیوں کے کرایوں کا اندازہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے دفاتر کے

کرائے سے ہو سکتا ہے جسے بہت معمولی قسم کی جگہ مہیا کی گئی ہے۔

● جون ۱۹۷۰ء تک جو لوگ مکانات تعمیر کر چکے ہیں یا کریں گے، انہیں کوئی پراپرٹی ٹیکس نہیں دینا ہوگا۔ جو کرایہ وہ وصول کریں گے اس پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہوگا۔ پھر اس بات کی گارنٹی حکومت کی پالیسی سے مل جائے گی کہ وہ مکانات لازماً بڑے بڑے کرایوں پر لیے جائیں گے۔

ایک سرکاری پارٹی کے معزز رکن نے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مخصوص طبقے کی حکومت، مخصوص طبقے کے ذریعہ اور مخصوص طبقے کے لیے کا اصول یہاں اختیار کیا گیا ہے، معزز رکن افسروں ہی پر برس رہے تھے جو ہر پالیسی صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر بناتے ہیں۔

○

باب ہفتم

پاکستان کے لیے عبوری معاشی نظام

جس معاشی نظام کا نقشہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے وہ نہ تو اسلام کا معیاری معاشی نظام ہے اور نہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہوں اور نہ میرے خیال میں پاکستان کی موجودہ صورت حال معیاری معاشی نظام کی متحمل ہو سکتی ہے کیونکہ جو خرابیاں معاشی نظام میں پیدا ہو چکی ہیں وہ ایک تدریج کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی ہیں کوئی انقلابی طریق کار اختیار کرنا معاشرے کو مزید پیچیدگیوں میں الجھا دے گا اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اس کا مقصد کوئی خیالی معاشرہ قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ملک کے موجودہ ذرائع و وسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان تمام خرابیوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے جنہیں سرمایہ دارانہ نظام زندگی نے یہاں پیدا کر دیا ہے اور جن کی تفصیلات پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی رکاوٹیں بھی موجود ہیں جن کا مختصر ذکر کر دینا ضروری ہے تاکہ عبوری نظام معیشت کی ضرورت آسانی سے سمجھ میں آسکے۔

سیاسی پس منظر

یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ انگریز جاتے وقت نظام حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں دے کر گیا جو اس کے اپنے تربیت یافتہ تھے اور تمام مسائل کے حل کے لیے انگریز ہی سے رہنمائی حاصل کرنے کے عادی تھے۔ اسی لیے سیاست پر سول سروس کا قبضہ ہو گیا اور تمام سیاسی اقتدار انتظامیہ کے ملازمین کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ان حضرات کا بیشتر حصہ پہلے ہی انگریز کے "مخصوص مفاد پرست" طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور جب اس پر کوئی نگرانی بھی نہ رہی تو اس نے اپنے سیاسی اختیارات کو معاشی استحصال کے لیے بھی استعمال کرنا شروع کر دیا پھر ایک انتہائی خود غرض طبقہ جو ان لوگوں سے مل کر مطلب برآری کے لیے آگے بڑھا اور صنعتکار اور سرمایہ دار بن گیا۔ جب مختلف آبپاشی کی اسکیموں سے افتادہ زمینیں آباد ہونا شروع ہوئیں تو ان سرکاری افسروں نے ان زمینوں پر بھی قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ اور صورت حال کچھ اس طرح کی ہو گئی ہے کہ ایک سرکاری افسر انتظامیہ کے اختیارات بھی رکھتا ہے، سیاست میں بھی دخیل ہے، زمیندار بھی ہے، صنعتوں میں بھی حصے رکھتا ہے اور اب تو ریٹائر ہونے کے بعد پبلک لیڈر ہونے کا بھی ذوق رکھتا ہے۔ یہ "فیصروں" کی ایک فوج ہے جو "ہمہ اوست" بنی بیٹھی ہے۔

معاشرتی خرابیاں

ان لوگوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اور اپنی مرعوب ذہنیت اور پست اخلاق و کردار کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر معاشرتی اور اعتقادی تبدیلیاں لانے کی بھی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ انہوں نے شراب نوشی کی وبا پھیلائی۔ سرکاری دعوتوں میں علی الاعلان

شراب کے دور چلائے، مغربی طرزِ معاشرت کو رائج کیا، مغربی لباس کو اپنایا، ایسے ہوٹلوں کی بنیاد رکھی جو بدکرداری کے اڈے ہیں۔ حکومت کے بعض محکمے "سیاحت" کے نام پر بے غیرتی کا وہ کام کرتے ہیں جسے سن کر بھی گھن آتی ہے۔ پی، آئی، اے نے لڑکیوں کا ایک دستہ تیار کیا ہے جسے پوری دنیا میں گھمایا جاتا ہے اور لوگوں کو "سیاحت" کی دعوت دی جاتی ہے۔ جوا رشوت دینے اور لینے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ بڑے کاروباری لوگ افسروں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں اور اور بڑی بڑی رقمیں ہار کر ان کا ایمان اور ضمیر جیت لیتے ہیں۔ سُود کو اتنا فروغ دیا گیا ہے اور حکومت کو اس پر اتنا اصرار ہے کہ شاید اسرائیل میں بھی سُود خوری کا یہ عالم نہیں ہوگا۔ پھر معاشرت کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نئی نئی اسکیمیں رائج کی جاتی ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی خاندانی منصوبہ بندی پر ۲۸ کروڑ روپیہ صرف کیا جارہا ہے اور اگلے پنجسالہ منصوبے کے دوران میں مزید رقم صرف کی جائے گی۔ اس کی تشہیر پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جارہا ہے اور اس کے تمام پراپگنڈے کا اصل مقصد یہ ہے کہ:

(۱) دولت کے ارتکاز اور افسروں کی لوٹ مار اور رشوت کی وجہ سے لوگوں کے اندر جو نفرت پیدا ہو رہی ہے، مفلسی اور بے کاری میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے یہ خطرہ پیدا ہونے کا ہر وقت احتمال ہے کہ عوام کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھے اور ان کی دولت اور عزت و آبرو لوٹنے والوں اور ان کی مفلسی کا مذاق اڑانے والوں کا سب کچھ جذبۂ انتقام کی نذر ہو جائے۔ اس لیے عوام کی توجہ کو ان سرمایہ داروں

اور عہدیداروں کی طرف سے ہٹانے کے لیے یہ تمام پراپیگنڈا محض اس لیے کیا جا رہا ہے کہ عوام اپنی مفلسی اور مصیبتوں کا باعث اپنی جان سے پیاری اولاد کو سمجھنے لگیں اور اپنے حقیقی دشمنوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھیں جو جونکوں کی طرح ان کا خون چوس رہے ہیں۔

(۲) غیرت و حمیت اور پاکدامنی کے تصور کو ختم کر کے اخلاقی بے راہ روی کو عام کر دیا جائے تاکہ ملک مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن جائے اور ان کو "مسلمان ہونے کی تہمت" سے چھٹکارا مل جائے اور نفس پرستی کے راستے میں اسلام کی رکاوٹ حائل نہ رہے۔ اسی غرض کے لیے مخلوط تعلیم، عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماعات، رقص و سرود اور درس گاہوں میں رقص و سرود کی تعلیم کو جاری کیا گیا ہے، خاندانی منصوبہ بندی کو بطور ایک مضمون کے بھی پڑھایا جا رہا ہے تاکہ شرم و حیا کا کوئی ادنیٰ سا تصور بھی باقی نہ رہے۔

(۳) اللہ تعالےٰ کے رازق ہونے اور اس پر توکّل کرنے اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے کا عقیدہ ختم ہو جائے اور پھر امریکہ اور روس کو اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنا محسن اور کارساز سمجھا جانے لگے۔ ایک صحتمند اور خوددار قوم کی حیثیت سے ہم ختم ہو جائیں اور ایک بیمار، ذلیل اور غیروں پر انحصار کرنے والی کمزور قوم کی حیثیت سے ہم داخلی طور پر سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور عہدیداروں کے غلام ہوں اور خارجی طور پر دنیا کی بڑی طاقتوں کے خیمہ بردار۔

اس سکیم کو بالکل جبر کے ساتھ اس ملک میں رائج کیا گیا ہے۔ کسی کو اس پر زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔

سوشلزم، اسلامی سوشلزم

یہ بھی ایک فریب ہے اور انہی مفاد پرست طبقوں کی عیارانہ چالوں میں سے ایک بہت بڑی چال ہے۔ اور اس ——— کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ سوشلزم کا سبق وہ لوگ دے رہے ہیں جو خود جاگیردار ہیں، بڑے بڑے زمیندار ہیں، سرمایہ دار ہیں اور صنعتکار ہیں۔ جن لوگوں نے خالص حرام ذرائع سے بے شمار دولت فراہم کر لی ہے، جب لوگ ان کی حرام کی جمع کی ہوئی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو وہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے انہیں سوشلزم کا نعرہ بلند کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے روپیہ بھی تقسیم کرتے ہیں۔ اس عیاری کی وجوہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سرمایہ دار خوب جانتے ہیں کہ سوشلزم کے یہاں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے لوگوں کو ایسے چکر میں ڈال دو جس کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ اگر سوشلزم کے قومی ملکیت کے تصور کو لانے کی کوشش کی جائے گی تو خود یہ غریب طبقہ اپنی چھوٹی چھوٹی ملکیتوں سے دستبردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوگا اور سوشلزم کے لانے والوں کو ان ہی لوگوں سے ٹکر لینا ہوگی جن کی بھلائی کا وہ دم بھرتے ہیں اور اس طرح وہ لازماً ناکام ہوں گے اور سرمایہ دار خود یہ تماشا بھی دیکھے گا اور سوشلزم کے علمبرداروں کا مربی و محسن ہونے کی وجہ سے محفوظ بھی رہے گا۔

یہ درحقیقت عام لوگوں کو آپس میں دست و گریبان کرا دینے کی ایک سازش ہے

۲۔ سوشلزم کا خمیر جس قسم کے حالات کی پیداوار ہے اور جس طرح کے ماحول

میں نشو ونما پاتا ہے ایسے حالات پاکستان میں پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ دنیا کے ہر مذہب نے انفرادی ملکیّت کے حق کو تسلیم کیا ہے اس لیے قومی ملکیت کے تصور کو لانے کے لیے سب سے پہلے مذہب ہی سے جنگ لڑنا پڑتی ہے اور پاکستان کے حالات یہ ہیں کہ اس کی بنیاد ہی مذہب پر ہے مذہب کے خلاف جنگ لڑنے کے معنی پاکستان کے خلاف جنگ لڑنے کے ہیں۔ اس کے دونوں حصّے محض مذہب کی بنیاد پر اکٹھے ہو کر پاکستان بناتے ہیں۔ اس لیے اس ملک کے باشندے ایسی کسی جنگ کے روادار نہیں ہو سکتے جو ملک کو ہی ختم کر دے۔ چنانچہ وہ سوشلزم کی مخالفت حب الوطنی کی بنا پر بھی کریں گے، مذہب کی بنا پر بھی اور اپنی ذاتی ملکیتوں کی بناء پر بھی۔ سرمایہ دار یہ چاہتا ہے کہ اس کا سرمایہ اس وقت تک محفوظ ہو جب تک ملک محفوظ ہے اور اگر ملک غیر محفوظ ہو جائے تو دنیا کے دوسرے ممالک موجود ہیں جہاں اس نے دولت جمع کر رکھی ہے۔

۳۔ سوشلزم کی تہذیب و تمدّن وہی مغربی تہذیب و تمدّن ہے جس میں عیاشی اور بدکرداری کے تمام مواقع اسی طرح موجود رہتے ہیں اس لیے سوشلزم کے پردے میں بداخلاقی اور بدکرداری کے فروغ کا جواز مہیا کیا جاتا ہے جسے اب سرمایہ داری کے نام پر جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔

۴۔ اسلام کے معاشی اور اخلاقی نظام کو لانے کی اگر کوشش کی جائے تو آبادی کے ۹۰ فیصدی لوگوں کی تائید حاصل ہو سکتی ہے اور اسے بہت جلد لایا جا سکتا ہے۔ اس کا راستہ روکنے کا ایک بہت بڑا حربہ یہ ہے کہ سوشلزم کا پرچار کیا جائے اور عوام کو یکسو نہ ہونے دیا جائے تاکہ اس انتشار میں سرمایہ دار اپنی اغراض کی تکمیل کرتے رہیں۔

ہے۔ اس کا راستہ روکنے کا ایک بہت بڑا حربہ یہ ہے کہ سوشلزم کا پرچار کیا جائے اور عوام کو یکسو نہ ہونے دیا جائے تاکہ اس انتشار میں سرمایہ دار اپنی عیاریوں سے لوگوں کو لوٹتے رہیں اور عیاشیوں میں لگے رہیں۔

۵۔ سوشلزم کا نعرہ لگا کر کچھ غیر ملکی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے جس سے بڑے بڑے کاروبار بھی چلتے ہیں اور ان غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے اسلامی نظام کا راستہ بھی روکا جا سکتا ہے اور کچھ دولت بھی ہاتھ آتی ہے۔ چنانچہ لاہور کے ایک سوشلزم کے علمبردار سرمایہ دار سوشلسٹ ممالک سے کوئلہ اور کاغذ منگواتے تھے اور کاروبار اور اخبار چلاتے تھے۔

۶۔ سوشلزم کی اب کوئی متعین شکل باقی نہیں رہی۔ ہر ملک میں ایک الگ انداز ہے۔ اس لیے سوشلزم میں ایسا راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے جس سے سرمایہ دار اختیارات کے مالک بھی بن کر بیٹھ جائیں اور عوام کو موجودہ بدحالی کے علاوہ مکمل غلامی میں بھی جکڑ سکیں

۷۔ معاشی وسائل و ذرائع اور سیاسی اختیارات کا سرکاری عہدیداروں کے ہاتھ میں مجتمع ہو جانے کا نام سوشلزم ہے اور اس کی طرف ہمارے سرکاری افسر پچھلے بیس سال سے گامزن ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے ہی آگے بڑھنا چاہتے ہیں اس لیے سرکاری افسر بھی سوشلزم کا ذکر کرنے لگے ہیں۔ لیکن ذرا محتاط انداز میں اسے اسلامی سوشلزم کہتے ہیں۔

۸۔ سامراجی طاقتیں مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور سوشلسٹ ممالک کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے سوشلزم کا زہر پھیلانا شروع کرتی

ہیں اور ان کے اخلاق کو اور اللہ کے دین اور ایمان کو تباہ کرتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کے اندر اس کا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے تو سوشلسٹ ممالک کے خلاف ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر سامراجی طاقتوں کی جھولی میں جا گرتی ہیں اور اگر وہ اس زہر سے متأثر ہو جاتی ہیں تو انہیں قابو میں لانا مشکل نہیں رہتا کیونکہ ایمان کے بغیر مسلمان کی قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے چنانچہ مشرقِ اوسط کی صورتِ حال سب کے سامنے ہے۔ کس طرح سوشلزم کے جراثیم پھیلا کر انہیں اسلام سے برگشتہ کر کے شکار کیا گیا۔ انڈونیشیا میں بھی یہی کھیل کھیلا گیا اور اب ان سوشلسٹوں کو عیسائی بنایا جا رہا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں سوشلسٹ حلقہ بگوشِ عیسائیت ہو رہے ہیں۔

۹۔ پاکستان میں ذہنی انتشار اور الجھاؤ پیدا کرنے اور اس قوم کو صحیح رخ کی طرف پیش قدمی کرنے، نظریۂ پاکستان پر یکسو ہونے اور قومی وحدت پیدا ہونے، وحدتِ خیال اور وحدتِ عمل سے باز رکھنے کے لیے اور اپنے مقصدِ وجود کے حصول کو روکنے کے لیے اس قوم کے اندرونی احمقوں اور بدخواہوں نے اور بیرونی دشمنوں نے مل کر جو سازش کی ہے اس سازش کا نام درحقیقت سوشلزم ہے۔

مذہبی تصوّرات

بدقسمتی سے اسلامی نظام کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں ایک بہت بڑی رکاوٹ خود ہمارے بعض نام نہاد علماء کے پیدا کردہ مذہبی تصورات ہیں۔ کہنے کو ہر شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو قیامت تک کے لیے ہے اور اللہ تعالےٰ نے فطرت

انسانی کے مطابق یہ دین کامل اس لیے نبیٔ آخر الزماںؐ کے ذریعہ بھیجا ہے کہ انسان اس پر عمل کریں اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کریں، لیکن دینِ کامل کا نام لینے کے بعد کچھ دوسرے مذہبی تصورات پیش کر دیئے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے ذہن کو الجھا دیا جاتا ہے۔ یہ تصوّرات اختصار کے ساتھ یہاں دیئے جا رہے ہیں:

(۱) ایک تصور یہ دیا جاتا ہے کہ چودہ صدیاں پیشتر ایک عجیب و غریب پاکیزہ شے آسمان سے نازل ہوئی تھی اور اسوقت ایک عجیب پاکیزہ مخلوق سرزمین عرب میں پائی جاتی تھی، جسے ہم صحابہ کرامؓ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان صحابہ کرامؓ نے اس آسمان سے نازل شدہ ہدایت پر عمل کرنے کا حق ادا کر دیا مگر ہم گناہ گار لوگوں کے لیے کہاں ممکن ہے کہ اس ہدایت پر عمل کر سکیں، یہ تو محض صحابہ کرامؓ کا کمال تھا اور ہمیں بس ان کے کمال کا اعتراف کرنا چاہیئے اور خود اس ہدایت پر صرف اعتقاد رکھنا چاہیئے۔ بس یہ ہے تمام اسلام۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب بھی اس ہدایت پر عمل ہو سکتا ہے تو وہ صحابہ کرامؓ کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم انسا بھی اس ہدایت پر عمل کر سکتے ہوں تو پھر صحابہؓ کا کمال کیا باقی رہ جاتا ہے؟ صحابہؓ کا کمال تو یہی ہے کہ ایک ناممکن بات کو ممکن بنا دیا۔ اس تصور سے ایک دفعہ ایک سرکاری افسر نے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ اس نے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کیا تم صحابہ کرامؓ کی برابری کر سکتے ہو؟ سب نے کہا۔ ہرگز نہیں! تو پھر تم اسلامی نظام کا نام کیوں لیتے ہو؟ گویا غیر شعوری طور پر اسلام کو ناممکن العمل قرار دے دیا گیا ہے۔

(۲) حکومت کرنا صرف دنیادار لوگوں کا کام ہے۔ نیک لوگوں کو حکومت سے کیا سروکار، انہیں تو صرف اللہ اللہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ بھلے لوگوں نے سیاست سے کنارہ کشی کرلی ہے اور افلاطون کے قول کے مطابق قدرت نے لوگوں کو یہ سزا دی ہے کہ بڑے لوگ ان پر مسلّط ہو گئے ہیں۔

(۳) ایک باطنی نظام ہے جس کو اولیاء اللہ چلاتے ہیں اور یہ حکمران تو صرف ظاہری پردہ ہیں۔ ان کے پیچھے ایک دوسرا نظام ہے۔ قطب اور اولیاء حکم جاری کرتے ہیں۔ اس کے مطابق یہ ظاہری حکمران مشین کی طرح چلتے ہیں۔

(۴) مرنے کے بعد ہمیں صرف اپنے اعمال کا حساب دینا ہے حکومت سے کیا سروکار۔ وہ جو چاہے کرتی رہے۔ ہمیں اپنے آپ کو درست رکھنا چاہیئے اور خدا و رسولؐ کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اپنے عقائد درست رکھو باقی سب ٹھیک ہے۔

(۵) امام مہدی آیئں گے تو حکومت خود ہی اسلامی ہو جائے گی ہمارے کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

(۶) معیار پرستی کا ذوق بھی مذہبی حلقوں ہی کا پیدا کردہ ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب تک معیاری مسلمان موجود نہ ہوں اسلامی نظام چل نہیں سکتا۔ اس وسوسہ اندازی کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ پوری آبادی کبھی معیاری مسلمان بنے اور نہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو حالانکہ ناقص مسلمان ناقص اسلامی نظام تو قائم کر سکتے ہیں اور یہ ناقص نظام مسلمانوں کو بہتر مسلمان بننے میں مدد دے گا اور بہتر مسلمان اس ناقص نظام کو بہتر سے بہتر بناتے چلے جائیں گے۔ دنیا میں اور کونسا

نظام ہے جو اپنی معیاری صورت میں چل رہا ہے۔ جب اسلامی نظام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ فطرتِ انسانی سے خوب واقف ہے۔ کیونکہ اس نے خود انسانوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی کمزوریوں کو جانتا ہے تو اس نے لازماً یہ گنجائش رکھی ہے کہ ناقص لوگ ناقص شکل میں اس نظام کو قائم کر لیں۔

اسلامی نظام اپنی ناقص شکل میں بھی دنیا کے بہترین سے بہترین نظام سے کروڑ درجہ بہتر طریق پر انسانی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور دُنیوی اور اُخروی فلاح کا ضامن ہے۔

(۷) مذہبی حلقوں نے کچھ غیر اسلامی ادارے اور رُسومات اسلام کے نام پر جاری کر رکھے ہیں اور یہ ذریعہ معاش بن چکے ہیں، اسلامی نظام کی آمد سے ان اداروں کو خطرہ ہے اور پیر پرستوں کی آمدنی متاثر ہوتی ہے۔

اس طرح پاکستان کے اندر سیاسی، معاشی اور مذہبی جاگیریں قائم ہیں اور ہمیں ان حالات میں معاشی نظام کے اندر ایسی تبدیلیاں لانا ہے جن سے یہ معاشرہ صحیح اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی شروع کر سکے۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ اگر اس عبوری معاشی نظام کو دیانتداری سے چلایا جائے تو صرف دس سال کے عرصے میں یہ عبوری نظام صحیح معاشی نظام میں تبدیل ہو جائے گا، بشرطیکہ سیاسی اور اخلاقی اصلاح کا کام جاری رہے اور عوامی نمائندے اپنا فرض

اس معاشی ڈھانچے میں ہر طرح کی اصلاح، ترمیم اور اضافے کی گنجائش موجود ہے یہ بہت ہی لچکدار اسکیم ہے جسے بتدریج اسلام کے معیاری معاشی

سانچے میں بالآخر ڈھلنا ہے، اس لیے اس اسکیم کا مرکزی مطمح نظر یہ ہے کہ ملک کے اندر ایک آزاد فضا پیدا ہو اور ایک خوشحال، مؤثر متوسط طبقہ پیدا ہو جو معاشی پریشانیوں سے تحفظ پا کر ان اعلیٰ انسانی اور اسلامی اوصاف کا مظاہرہ کرے، جو ایک اسلامی مملکت میں مطلوب ہیں، اور وہ جیتا جاگتا معاشرہ معرضِ وجود میں آئے جس کے نقوش محض کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں اور جسے کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے انسان بیتاب ہیں۔ اس اسکیم کے تین حصے ہیں۔ اول قومی ملکیت یعنی وہ شعبے جو براہ راست حکومت کی تحویل میں ہوں۔ دوم وہ دائرۂ کار جس میں انفرادی ملکیت ہو اور جس پر قانونِ وراثت کا اطلاق ہوتا ہو اور سوم ایک اسٹیٹ انشورنش کارپوریشن کا قیام جو بیکار، معذور اور عارضی طور پر محتاج ہونے والے لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری لے، انہیں مناسب روزگار مہیا کرے اور سال میں کم از کم ایک ہزار خاندانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ خود کفیل بھی ہو سکیں اور صاحبِ نصاب بھی بن سکیں ان تینوں حصوں کو اس طرح باہم پیوست کر دیا گیا ہے اور ایسے مناسب انتظامات کر دیئے گئے ہیں کہ نہ تو اجتماع اتنا طاقتور ہو جائے کہ فرد غلام بن جائے اور اس کی معاشی آزادی اور دوسرے حقوق سلب ہو جائیں اور وہ بے جان مشین کا پرزہ بن جائے اور نہ انفرادی ملکیت کو اتنا بے لگام کر دیا جائے کہ یہ ملکیتیں ظلم و جبر کا ذریعہ بن جائیں۔ حکومت اور فرد کے درمیان ایک ایسے فلاحی ادارے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جو دبے ہوئے لوگوں کو ابھار کر اور معاشی سہارا دے کر اوپر اٹھائے گا اور بے سہارا لوگوں کو ان کا حق سوسائٹی اور فرد

دونوں سے حاصل کر کے مہیا کرے گا۔ یہ ادارہ اپنی صحیح شکل میں جب کام شروع کر دے گا تو ایک صحتمند سیاست کی بنیاد پڑ جائے گی اور انقلابات اور طالع آزماؤں کا راستہ بھی بند ہو جائے گا، ایک آزاد فضا ملک میں پیدا ہو جائے گی اور اس آزاد فضا میں صحیح اور منصفانہ انتخابات ہو سکیں گے، مفلسوں کے ایمان وضمیر اور رائے کو سرمایہ دار خرید نہیں سکیں گے۔

ا۔ قومی ملکیّت

۱۔ بینکنگ اور انشورنس

انہیں فوراً قومی ملکیّت میں لے کر سود، سٹّہ اور زر آفرینی کے نجی ذرائع ختم کر دینے کی ضرورت ہے۔

۲۔ افتادہ زمینیں

۳۔ جنگلات

۴۔ کانیں

۵۔ پہاڑ

۶۔ دریا

۷۔ سمندر

۸۔ فولاد کے کارخانے

۹۔ کیمیاوی کھاد اور کیمکلیز تیار کرنے والے کارخانے

۱۰۔ ریلوے اور ریلوے کے ورکشاپ

۱۱- جہاز اور جہاز سازی کے کارخانے

۱۲- بجلی، تیل، گیس، پانی، کوئلہ

۱۳- درآمد، برآمد

۱۴- اسلحہ سازی کے کارخانے

۲- نجی ملکیّت

۱- قابلِ کاشت زمینیں

۲- زرعی پیداوار سے متعلق تمام صنعتیں

۳- تجارت

۴- چھوٹی صنعتیں

۳- اسٹیٹ انشورنس کارپوریشن

۱ زکوٰۃ، عشر

۲ صدقات

۳ اوقاف

۴ ترقیاتی ٹیکس

۵ نابالغوں کی جائیدادوں کا انتظام

۶- ضائع ہونے والی جائیدادوں کا انتظام

۷- لاوارث افراد کا ترکہ

۸- بیواؤں، یتامیٰ اور مستحق افراد کی اعانت

۹- بیکار افراد کو وظیفہ

۱۰- روزگار مہیا کرنے کا انتظام

۱۱- عمر رسیدہ لوگوں کی خدمت

۱۲- کم آمدنی والے کنبوں کو مناسب امداد دے کر صاحبِ نصاب بنانا

۱۳- مزدوروں کے حقوق کی حفاظت

۱۴- حج اور دینی شعائر کا مناسب انتظام

۱۵- دینی اور رفاہی اداروں کی نگرانی

۱۶- کم آمدنی والے لوگوں کو مکانات مہیا کرنا

۱۷- ضبط شدہ جائدادوں کا انتظام

۱۸- صحت

۱۹- تعلیمات

۲۰- سوشل ویلفیئر

۲۱- لیبر

نوٹ :- حکومت کے تین شعبے صحت، تعلیمات اور معاشرتی بہبود انشورنس کارپوریشن کی تحویل میں آجانے سے حکومت کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی نظامِ محاصل میں بھی تبدیلی کرنا ہوگی اور ۵۰ ایکڑ سے کم اراضی کے مالکان

سے مالیہ وصول نہیں کیا جائے گا، صرف عُشر وصول کیا جائے گا۔ گھوڑے پالنے والوں، بھیڑ بکریاں اور دوسری مویشی پالنے والوں سے بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

تشریحات

قومی ملکیت میں جو معاشی شعبے داخل ہیں ان کے متعلق پالیسی یہ ہونی چاہیئے

(۱) بنکنگ اور انشورنس کو فوراً قومی ملکیت میں لے کر سود، سٹہ اور زر اندوزی (capital formation) کے تمام ذرائع بند کر دیئے جانے چاہئیں اور بنکوں کو خالص تجارتی اصولوں پر چلانا چاہیئے۔

(۲) افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں اور جوں جوں یہ زمینیں قابل کاشت ہوتی جائیں انہیں اسی علاقے کے چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جو زمینیں سرکاری افسروں اور وزیروں وغیرہ کو اگست ۱۹۴۷ء کے بعد عطیے کے طور پر یا برائے نام قیمت پر دی گئی ہیں، واپس لے کر تمام چھوٹے کاشتکاروں کو ۲۵ ایکڑ فی کنبہ کے حساب سے تقسیم کی جائیں۔

(۳) جنگلات سے متعلق صنعتیں قائم کرنے اور ان علاقوں کے لوگوں کو ان صنعتوں میں کام کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ جنگلات کو تباہ کرنے اور ٹھیکیداروں کی چوری کا مؤثر سدِ باب کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

(۴) کانوں کے متعلق جو مراعات مصنوعی طور پر بعض لوگوں کو دی گئی ہیں ان

کی تحقیقات ہونی چاہیئے اور تمام ناجائز انتفاع کے ذرائع ختم ہونے چاہئیں

(۵) جو کارخانے حکومت کی تحویل میں ہوں ان کے ملازمین کے حصّے ...

ہونے چاہئیں اور انہیں عدالتوں کی طرف رجوع کرنے اور انصاف حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

(۶) سرکاری اور غیر سرکاری کارخانوں کے ملازمین کی تنخواہ کی شرح کا تعین اس طرح ہونا چاہیئے کہ ہر کنبہ کو کم از کم دو سو روپیہ ماہوار مل سکے اور زیادہ سے زیادہ کی حد بھی مقرر ہونی چاہیئے۔ بحالاتِ موجودہ کسی شخص کو بھی -/۲۰۰۰ سے زیادہ تنخواہ نہیں ملنی چاہیئے۔ تنخواہوں میں موجودہ تفاوت ایک اور ۱۰۰ کی نسبت سے ہے اسے فوراً ایک اور ۱۵ پر لانا چاہیئے اور پانچ سال کے اندر یہ نسبت اور کم کر کے ایک اور ۱۰ کی کر دینی چاہیئے۔

نجی ملکیت

(۱) قابل کاشت زمینوں کے متعلق چونکہ زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر ہو چکی ہے اور تمام زمیندار اور جاگیردار اس اصول کو قبول کر کے اپنی فالتو اراضی دے چکے ہیں اس لیے تحدید ملکیت کا اصول اب ایک تسلیم شدہ اصول ہے اور اس میں ضرورت کے مطابق مزید کمی بھی کی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں حدِ ملکیت ۱۰۰ ایکڑ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔

(۲) کم سے کم اراضی کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی لیکن یہ رہنما اصول پیش نظر رہنا چاہیئے کہ عام طور پر ایک کاشتکار کنبہ کے پاس ۲۵ ایکڑ اراضی ہو۔

سرکاری افسروں، وزیروں اور مخصوص طبقوں کو جو غلط بخشیاں ہوئی ہیں وہ زمین ایک کروڑ ایکڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگر چھوٹے کاشتکاروں کو یہ زمین تقسیم کی جائے اور ان کی موجودہ مقبوضہ زمینوں کے اشتمال کے ذریعہ بھی مناسب تقسیم کا انتظام کیا جائے تو پچاس ہزار سے زائد کنبے خود کفیل ہو سکتے ہیں۔

(۳) آئندہ قابل کاشت اراضی کو صنعتوں کے لیے استعمال کرنے کے لیے بہت ہی خصوصی حالات میں اجازت دینی چاہیئے اور وہ بھی ان صنعتوں کے لیے جو زرعی پیداوار سے متعلق ہیں۔ دوسری تمام صنعتوں کے لیے بنجر زمینیں استعمال کی جانی چاہیئں۔

(۴) ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ حکومت نے چھوٹے کاشتکاروں کے رقبے معمولی قیمت پر لے لیے اور بڑے صنعتکاروں اور بعض حالات میں خود بڑے زمینداروں کو شوگر ملیں یا دوسرے کارخانے قائم کرنے کے لیے برائے نام قیمت پر دے دیئے۔ ایسے تمام معاملات کی تحقیق ہونی چاہیئے اور چھوٹے کاشتکاروں کو اپنی اراضی کی وہ قیمت ملنی چاہیئے جو مارکیٹ میں عام قیمت ہے۔

(۵) سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق دیہاتی علاقوں میں مغربی پاکستان میں دس سال سے زیادہ عمر کے ۱۷ لاکھ ۹ ہزار ۲۶۷ افراد بیکار تھے اور مشرقی پاکستان میں ۱۸ لاکھ ۶۹ ہزار ۳۰۱۔ حالانکہ مغربی پاکستان میں زرعی وسائل مشرقی پاکستان سے تین چار گنا زیادہ ہیں۔ اس کی اصل وجہ زمینوں کی غلط تقسیم اور زمینداری ہے۔

صنعت و حرفت

(۱) زرعی پیداوار سے متعلق تمام کارخانوں میں کاشتکاروں، سرمایہ لگانے والوں اور مزدوروں کا حصہ ہونا چاہیئے اور تمام کارخانے کوآپریٹیو بنیاد پر چلنے چاہئیں مینجنگ ایجنسی کا سلسلہ ختم کر دیا جانا چاہیئے۔

(۲) صنعتی ترقی کے سلسلے میں جاپان کی صنعتی ترقی کے نمونے پر آئندہ کام ہونا چاہیئے اور چھوٹی اور سستی صنعتوں کے قیام کی کوشش کی جانا چاہیئے تاکہ تمام بیکار لوگ یا وہ لوگ جن کے پاس فالتو وقت بچ جاتا ہے صنعتی شعبے میں حصہ لے سکیں۔

(۳) لائسنسوں اور پرمٹوں کی پالیسی ختم ہونا چاہیئے اور اگست ۱۹۴۷ء کے بعد لائسنسوں اور پرمٹوں کی غلط بخشیوں اور خرید و فروخت کی تحقیقات ہونا چاہیئے اور جن لوگوں نے محض لائسنس اور پرمٹ فروخت کر کے دولت حاصل کی ہے وہ تمام ضبط ہونی چاہیئے۔

(۴) اسی طرح روٹ پرمٹوں کی پالیسی پر بھی نظرثانی کی جائے اور جن لوگوں نے محض "دلالی" کے ذریعہ دولت جمع کی ہے وہ تمام سرمایہ ضبط کیا جائے۔

(۵) کسی شخص کے پانچ سے زیادہ کمپنیوں کا ڈائرکٹر ہونے پر بھی پابندی عائد کی جانی چاہیئے۔

(۶) ملازمین کے لیے تنخواہوں کا معیار اس طرح ہونا چاہیئے کہ ایک کارکن کو کم از کم -/۲۰۰ روپیہ تنخواہ مل سکے اور کسی ٹیکنیکل ڈائرکٹر یا دوسرے شخص کو

۳ ہزار سے زیادہ تنخواہ نہیں ملنی چاہیئے۔

(۷) صنعتوں کو ایسا تحفظ دینا بالکل غلط ہے جس کے تحت وہ من مانی قیمتیں وصول کرتے رہیں اور سرکاری عملے کو بھی حرام خوری کی عادت ڈالیں۔

(۸) غیر ملکی قرضوں سے جن صنعتوں کی بنیاد پڑی ہے یا فروغ حاصل ہوا ہے انہی صنعتوں سے غیر ملکی قرضے ادا کئے جائیں۔

(۹) وہ تمام سرمایہ جو غیر ملکی بنکوں میں جمع کیا گیا ہے وہ تمام سرمایہ حکومت کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہیئے اور اس سے تمام غیر ملکی قرض ادا کر دینا چاہیئے تاکہ سود کی لعنت سے نجات حاصل ہو سکے۔

اسٹیٹ انشورنس کارپوریشن

اس ادارے کے ارکان کی تعداد بیس کے قریب رکھی جا سکتی ہے جنہیں دونوں صوبوں کی صوبائی اسمبلیاں اور قومی اسمبلی کے ممبران غیر سیاسی بنیاد پر محض ان کی صلاحیتِ کار، دیانت و امانت اور اخلاقی ساکھ کی بنا پر منتخب کریں۔ ان ارکان کی عمر ۵۵ سال سے زیادہ ہو اور مسلمان ہوں۔ ان کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے:

	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	کل میزان
علمائے کرام	۴	۴	۸
ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج	۳	۳	۶

مزدور رہنما	۱	۱	۲
صنعتکار	۱	۱	۲
سوشل کام کرنے والے لوگ	۱	۱	۲

اگر ملک میں کسی وقت ایوان بالا قائم کیا جائے تو ان سب حضرات کو ایوانِ بالا کا رکن ہونا چاہیئے۔

اس ادارے کا الگ بجٹ ہو۔ نیز ایک خاص ٹیکس ان لوگوں پر لگایا جائے جن کی آمدنی ۳۶ ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ ہو۔ یہ ٹیکس ۳۶ ہزار سے زائد سالانہ آمدنی پر لگایا جائے۔ اور یہ رقم اس کارپوریشن کے لیے لی جائے۔ آمدنی خواہ مکانات کے کرائے سے ہو، کاروبار یا صنعت سے ہو یا زرعی پیداوار سے ہر قسم کی آمدنی پر یہ ٹیکس عائد کیا جانا چاہیئے۔ جن لوگوں کے ذرائع آمدنی کئی قسم کے ہیں ان کی کل سالانہ آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔

زکوٰۃ اور عشر کی آمدنی کا تخمینہ ۹۰۰ کروڑ روپے سالانہ ہے اور اوقاف کی آمدنی نیز دوسرے صدقات کی آمدنی بھی ۲۵ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ علاوہ ازیں لاولد لوگوں کی جائداد اور حرام کی جمع کی ہوئی دولت کی ضبطی سے جو رقوم حاصل ہوں وہ بھی اس ادارہ کے پاس ہی جمع ہوں۔ اس طرح اس کی آمدنی بہت معقول ہو سکتی ہے اور یہ ادارہ وہ تمام کام کر سکتا ہے جو ایک مسلم معاشرے کے فرائض میں داخل ہیں۔

۱۔ تمام بیکار لوگوں کی کفالت اور ان کے لیے مناسب روزگار مہیا کرنا۔

۲۔ ضعیف اور بے سہارا لوگوں کی امداد

۳۔ یتیموں اور بیوگان کی کفالت اور یتامیٰ کی تعلیم۔

۴۔ ایک ہزار خاندانوں کی سال میں اس طرح امداد کہ وہ خود کفیل ہونے کے علاوہ صاحبِ نصاب ہوجائیں۔

۵۔ امداد باہمی کی تحریک ملک گیر پیمانے پر چلانا اور کاشت کاروں اور چھوٹے کاریگروں کو بلا سود قرض مہیا کرنا۔

۶۔ مساجد، درس گاہوں، دینی اداروں اور اوقاف کی اصلاح حال؛ حج کے انتظامات۔

۷۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے مکانات کی تعمیر اور ایسے مکانات کو آسان قسطوں پر بلا سود ضرورت مندوں کو منتقل کرنا۔

۸۔ چھوٹی صنعتوں کے قیام میں کاریگروں کی امداد۔

۹۔ مسافروں کے لیے سہولتیں مہیا کرنا۔

۱۰۔ مفلوک الحال مصیبت زدہ لوگوں کو قانونی امداد مہیا کرنا۔

۱۱۔ مظلوموں کو ان کا حق دلوانا۔

۱۲۔ سوشل ویلفیئر اور لیبر ویلفیئر۔

۱۳۔ تعلیمات اور صحت۔

۱۴۔ اسلامی معاشرت کی ترویج و اشاعت۔

یہ ادارہ نیم سرکاری ہوگا اور اس کو معرض وجود میں لانے کے لیے پارلیمنٹ ایک مبسوط قانون بنائے گی اور حقوق، اختیارات اور دائرہ عمل تجویز کرے گی۔ اس ادارے کے معرض وجود میں آجانے سے نہ تو حکومت عوام کے حقوق

پر ڈاکہ ڈال سکے گی اور نہ افراد کا کوئی گروہ ایسا طاقتور ہو سکے گا کہ وہ اپنے وسائل کو استعمال کر کے حکومت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکے۔ فرد اور معاشرے کا باہمی ربط ایسے طریقہ پر رہے گا کہ اسلام کے تصورِ عدلِ اجتماعی کو بروئے کار لایا جا سکے اور ایک مؤثر قسم کا متوسط طبقہ ملک میں پیدا ہو جائے۔ محتاجوں اور مُسرفین دونوں کی تعداد کم سے کم ہو اور خود کفیل خوشحال کنبوں میں اضافہ ہو۔

کرنے کے کام

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے وقت عام لوگوں کا تصوّر یہ تھا کہ اس اسلامی مملکت میں دولت کی ہوس، ناجائز ذرائع، حرام خوری اور بد دیانتی کو ختم کر دیا جائے گا اور دیانتداری اور خدا ترسی کو فروغ دیا جائے گا اس لیے عام لوگ بڑی قناعت کے ساتھ گزر اوقات کرتے رہے اور لُوٹ مار سے اجتناب کرتے رہے لیکن بد قسمتی سے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے چند ہزار بد دیانت، دولت کے حریص لوگ آگے بڑھے اور شرفاء کی نوزائیدہ مملکت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر تل گئے۔ انھوں نے حکومت کے اندر رہ کر ناجائز فائدے اٹھائے۔ حکومت کے با اختیار افسر ہو کر لُوٹ مچائی اور حکومت کے ساتھ ساز باز کر کے تاجر اور صنعتکار بن کر بڑی بیدردی سے ملک کو لوٹا۔ اب اس ملک کو اگر صحیح راستے پر لے جانا مقصود ہے اور نیکی کو فروغ دینا اور بدی کی حوصلہ شکنی کرنا ہے تو مندرجہ ذیل اقدامات از بس

ضروری ہیں:

ا۔ فوری کرنے کے کام

(۱) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جتنی سرکاری زمینیں ۲۵ ایکڑ سے زیادہ مقدار میں وزراء، سرکاری ملازمین، اسمبلیوں کے ممبران اور دوسرے مخصوص مفاد کے حامل لوگوں کو دی گئی ہیں تمام بیک قلم منسوخ کر دی جائیں اور ان کاشتکاروں کو دی جائیں جن کے پاس گزارہ یونٹ سے کم رقبے ہیں آ ایسے متروکہ رقبے ان مہاجرین کو دیئے جائیں جن کے پاس ۵ ایکڑ سے بھی کم رقبہ ہے۔

(۲) پرمٹوں، لائسنسوں اور روٹ پرمٹوں کے ذریعہ حاصل کی ہوئی تمام دولت اور ناجائز طریقوں سے پیدا کردہ تمام جائیدادیں ضبط کر لی جائیں۔

(۳) متروکہ جائیدادیں جو سرکاری اثر ورسوخ کے ذریعے حاصل کی گئی ہیں ان کی الاٹمنٹ منسوخ کر کے مستحق مہاجرین کو دی جائیں۔

(۴) تمام کارخانہ داروں کی دولت کا احتساب کیا جائے اور ناجائز حصہ ضبط کیا جائے۔

(۵) ایک جائز شرحِ منافع مقرر کر کے ملک میں تیار ہونے والے سامان کی قیمت کم کی جائے۔

(۶) سرکاری اور غیر سرکاری ملازمین کی تنخواہ کم از کم دو سو روپیہ ماہوار اور زیادہ سے زیادہ تین ہزار روپیہ ماہوار مقرر کی جائے۔ کسی شخص کی تنخواہ تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔

(۷) تمام بد دیانت افسروں اور سابق وزراء کا محاسبہ کیا جائے اور ہر بد دیانتی اور عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے معاملے میں باقاعدہ سزا دی جائے اور جو دولت جمع کی گئی ہو ضبط کی جائے۔

(۸) تمام کمپنیوں میں مینیجنگ ایجنسی کا سسٹم ختم کیا جائے۔

(۹) بنکنگ اور انشورنس کو قومی ملکیت میں لے کر سود کو فوراً ختم کیا جائے۔

(۱۰) سٹہ اور جوئے کی ہر قسم کو بند کیا جائے۔

(۱۱) شراب کی درآمد بند کر دی جائے اور ملک میں تیار کرنے والے کارخانوں کو دوسرے مفید کاموں میں لگایا جائے۔

(۱۲) صنعتوں میں مینیجنگ ایجنسی کو ختم کیا جائے اور تمام حصہ داروں کو جائز منافع حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ اب تمام منافع مینیجنگ ڈائریکٹر اور مینیجنگ ایجنٹس ہی ہضم کر جاتے ہیں اور حصہ داروں کو کچھ نہیں ملتا۔

(۱۳) جن لوگوں کی مجموعی آمدنی ۳۶ ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ ہو ان پر سپر ٹیکس لگایا جائے۔

(۱۴) تمام جاگیروں کو ختم کیا جائے اور اس کے لیے کوئی معاوضہ نہ دیا جائے۔

(۱۵) تمام ناجائز زمینداریوں کو بھی بلا معاوضہ ختم کیا جائے۔

(۱۶) تمام جائز زمینداریوں کو محدود کیا جائے۔

ب۔ آئندہ معاشی پالیسی

(۱) تمام لوگوں کے درمیان بہتر اور منصفانہ تقسیم دولت کا انتظام کیا جائے

(۲) کسانوں، مزدوروں اور دوسرے کم آمدنی والے طبقوں کو خوشحال بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

(۳) رزقِ حلال حاصل کرنے کے لیے دروازے کھول دیئے جائیں اور حرام کی دولت جمع کرنے کے تمام مواقع ختم کر دیئے جائیں۔

(۴) معاشی اور معاشرتی انصاف حاصل کرنا لوگوں کے لیے آسان بنایا جائے اور قانونی نظام کی پیچیدگیوں کو ختم کیا جائے۔

(۵) حرام خوروں کو برسرِ عام سزا دی جائے اور حرام ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو ضبط کیا جائے۔

(۶) لوگوں کو اپنی آزاد مرضی سے معاشی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے برابر کے مواقع مہیا کیے جائیں اور ایسی پابندیاں ختم کی جائیں جن سے مراعات یافتہ طبقے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۷) پرمٹوں، لائسنسوں اور روٹ پرمٹوں کی پالیسی تبدیل کی جائے۔

(۸) وہ تمام ادارے بند کیے جائیں جو کچھ لوگوں کو سود پر بڑی بڑی رقمیں قرض دے کر انہیں وسائلِ دولت سے بہرہ یاب ہونے کے مواقع مہیا کرتے ہیں اور دوسروں کو محروم کرتے ہیں۔

(۹) تمام مالیاتی ادارے حکومت کی تحویل میں لیے جائیں اور سود کو ختم کر دیا جائے۔

(۱۰) تنخواہوں کا معیار بتدریج ایک اور دس کی نسبت تک لایا جائے۔

ضمیمے

درآمد و برآمد (غیر ملکی تجارت)

کروڑوں میں

سال	درآمد	برآمد	نفع یا نقصان	
سنہ ۱۹۴۷-۴۸	۳۵٫۹۲	۷۰٫۳۴	۳۴٫۴۲	بچت
سنہ ۴۸-۴۹	۱۴۵٫۹۱	۹۵٫۷۶	۵۰٫۱۵	نقصان
سنہ ۴۹-۵۰	۱۲۹٫۷۱	۱۱۹٫۴۱	۱۰٫۳۰	"
سنہ ۵۰-۵۱	۱۶۲٫۰۰	۲۵۵٫۳۵	۹۳٫۳۵	بچت
سنہ ۵۱-۵۲	۲۲۳٫۷۳	۲۰۰٫۸۶	۲۲٫۸۷	نقصان
سنہ ۵۲-۵۳	۱۳۸٫۳۶	۱۵۰٫۹۹	۱۲٫۶۳	بچت
سنہ ۵۳-۵۴	۱۱۱٫۸۰	۱۲۸٫۶۰	۱۶٫۸۰	بچت
سنہ ۵۴-۵۵	۱۱۰٫۳۳	۱۲۲٫۳۰	۱۱٫۹۷	بچت
سنہ ۵۵-۵۶	۱۳۲٫۵۱	۱۷۸٫۳۷	۴۵٫۸۶	بچت
سنہ ۵۶-۵۷	۲۳۳٫۴۶	۱۶۰٫۷۶	۷۲٫۷۰	نقصان
سنہ ۵۷-۵۸	۲۰۵٫۰۰	۱۴۲٫۱۷	۶۲٫۸۳	"
سنہ ۵۸-۵۹	۱۵۷٫۸۴	۱۳۳٫۵۳	۷۵٫۳۱	"
سنہ ۵۹-۶۰	۲۴۶٫۱۰	۱۸۴٫۲۷	۶۱٫۸۳	"
سنہ ۶۰-۶۱	۳۱۸٫۷۶	۱۷۹٫۹۴	۱۳۸٫۸۲	"

سنہ ۶۲-۶۱	۳۱۰،۹۱	۱۸۴،۳۴	۱۲۶،۵۷	نقصان
سنہ ۶۳-۶۲	۳۸۱،۸۸	۲۲۴،۷۳	۱۵۷،۱۵	"
سنہ ۶۴-۶۳	۴۴۳،۰۰	۲۲۹،۹۱	۲۱۳،۰۹	"
سنہ ۶۵-۶۴	۵۳۷،۴۲	۲۴۰،۷۸	۲۹۶،۶۴	"
سنہ ۶۶-۶۵	۴۲۰،۸۳	۲۷۱،۷۷	۱۴۹،۰۶	"
سنہ ۶۷-۶۶ جولائی مارچ	۳۶۲،۳۳	۲۱۷،۲۳	۱۴۵،۱۰	"

(پاکستان اکنامک سروے سال ۶۷-۱۹۶۶)

کہا جاتا ہے کہ ابتدائی سالوں میں جنگ کوریا کی وجہ سے برآمد ہونے والی اشیاء پٹ سن اور کپاس وغیرہ کی قیمتیں بین الاقوامی مارکیٹ میں اچھی تھیں، اس لیے غیر ملکی تجارت میں ہمیں نفع حاصل ہو رہا تھا۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ ابتدائی سالوں میں ہم نے مشروط قرضے نہیں لیے تھے اور اپنا مال زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے تھے اور غیر ملکی مصنوعات خریدتے وقت بھی کوئی پابندی نہیں تھی اور جہاں سے اچھا اور سستا مال ملتا تھا خرید لیتے تھے۔ قرضے حاصل کرنے کے بعد ہم پر یہ پابندی عائد ہو گئی کہ مہنگے داموں چیزیں خریدیں اور سستے داموں فروخت کریں۔ اگر واقعی کوریا کی جنگ کی وجہ سے ہمیں بچت ہو رہی تھی تو ویٹ نام کی جنگ کی وجہ سے بھی ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اصل مسئلہ آزاد تجارت اور پابند تجارت کا ہے کوریا اور ویٹ نام کی جنگ کا نہیں۔

گندم، چاول اور چینی کی درآمد

سنہ	گندم	چاول	چینی
۱۹۴۷-۴۸ سنہ ء	۴۴،۶۵۹	۵،۵۱۳	×
۴۸-۴۹ سنہ ء	۱۴۴	۱۹،۸۳۳	×
۴۹-۵۰ سنہ ء	×	۴۳،۱۷۰	×
۵۰-۵۲ سنہ ء	×	×	×
۵۲-۵۳ سنہ ء	۸،۷۳،۰۸۳	×	۴۹،۵۱۷
۵۳-۵۴ سنہ ء	۷،۵۹،۰۳۵	×	۵۹،۹۰۹
۵۴-۵۵ سنہ ء	×	×	۸۵،۱۷۵
۵۵-۵۶ سنہ	۱،۲۱،۲۸۲	۵۴،۸۷۸	۸۶،۷۳۶
۵۶-۵۷ سنہ ء	۷،۶۷،۷۹۳	۵،۴۱،۲۶۸	۸۷،۷۶۸
۵۷-۵۸ سنہ ء	۸،۶۲،۳۰۹	۴،۲۱،۲۶۷	۶۸،۱۶۴
۵۸-۵۹ سنہ ء	۵،۳۶،۳۶۵	۱،۸۲،۲۱۰	۸۶،۵۶۳
۵۹-۶۰ سنہ ء	۹،۶۲،۴۱۲	۳،۶۰،۹۶۰	۲۳
۶۰-۶۱ سنہ ء	۱۳،۰۹،۵۰۸	۳،۸۲،۴۱۴	۷۹
۶۱-۶۲ سنہ ء	۸،۵۳،۰۹۷	۲،۰۸،۳۴۱	۸۲،۷۵۳
۶۲-۶۳ سنہ ء	۱۶،۱۱،۶۲۹	۲،۴۴،۶۴۳	۱،۱۴،۰۸۱

سنہ ۶۳-۶۴ء	۱۵،۱۲،۷۰۷	۱،۴۲،۷۲۴	۱۲۵۲
سنہ ۶۴-۶۵ء	۱۶،۹۲،۷۳۱	۶۱،۵۶۴	۹۶،۹۶۲
سنہ ۶۵-۶۶ء	۹،۱۵،۸۲۹	۴۷،۹۴۸	۷۳،۱۷۹
سنہ ۶۶-۶۷ء	۱۷،۶۴،۴۲۳	۱،۵۵،۷۷۹	×

کلّ ۲،۰۲،۷۶۷

اگر ان اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ درآمد میں زیادتی کی اصل وجہ اسمگلنگ ہے جو بہت ہی بااثر افراد کے زیر سایہ ہو رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سنہ ۵۸-۵۹ء میں مارشل لاء کے نفاذ اور سنہ ۶۵-۶۶ء میں جنگ کی وجہ سے اسمگلنگ عارضی طور پر رک گئی اور ہمیں گندم صرف نصف مقدار میں درآمد کرنا پڑی۔ ترقیات اور درآمد دونوں بد دیانتی کی نذر ہو رہی ہیں اور کچھ لوگوں کے ذوقِ فراہمیٔ دولت کے لیے فضا سازگار کر رہی ہیں۔

غیر ملکی قرضوں کی تقسیم سرکاری اور نجی شعبوں میں

۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک جو قرض غیر ممالک سے حاصل کیا گیا اس کی تقسیم سرکاری اور نجی شعبوں میں حسب ذیل طریقے سے ہوئی ہے :

۱۔ پروجیکٹ قرضے ملین ڈالر

	سرکاری	نجی	کل رقم
زراعت	۸۲٫۲۹۵	—	۸۱٫۱۹۵
پانی اور بجلی	۴۳۸٫۹۴۳	۵۶٫۱۰۰	۴۹۵٫۰۴۳
صنعت و حرفت	۲۳۲٫۰۷۱	۵۰۳٫۹۵۰	۷۳۶٫۰۲۱
ایندھن اور کانیں	۳۳٫۱۲۶	۵۸٫۷۲۳	۹۱٫۸۴۹
ٹرانسپورٹ	۶۷۷٫۱۱۸	۲۱٫۹۲۸	۶۹۹٫۰۴۶
سوشل سروس	۱۰۵٫۸۳۰	—	۱۰۵٫۸۳۰
۲۔ دوسرے قرضے	۱۷۳٫۷۸۳	۶۵۳٫۰۱۷	۸۲۶٫۸۰۰
۳۔ کل میزان	۱۷۴۳٫۱۶۶	۱۲۹۳٫۷۱۸	۳۰۳۶٫۸۴۴

اس سے دو باتیں بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں اوّل یہ کہ ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے کے حاصل کردہ غیر ملکی قرضوں میں سے ایک بہت بڑی رقم صنعت و حرفت کے نجی شعبہ میں خرچ کی گئی ہے اور دوسرے قرضوں کا بہت بڑا حصہ بھی نجی شعبے میں صرف ہوا ہے اور اس طرح صنعتکاروں کی ایک کھیپ تیار

کر دی گئی ہے جو فائدہ اٹھا رہی ہے اور قرضوں کا بوجھ غریب عوام پر ڈال دیا گیا ہے۔ سرکاری شعبے میں جو رقم خرچ ہوئی ہے اس نے ٹھیکیداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا ہے جو سرکاری افسروں کے ساتھ مل کر ساٹھ فیصدی سے زیادہ رقم ہضم کر جاتا ہے اور قرضوں کا بوجھ عام لوگوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سونا، ڈالر اور پونڈ کا محفوظ سرمایہ اور جاری شدہ کرنسی

سال	زرِ محفوظ	جاری شدہ کرنسی
۱۹۴۸ء	۱ کروڑ ۴۱ لاکھ ۶۱ ہزار	۱۶۸ کروڑ ۹۴ لاکھ روپے
۱۹۴۹ء	۹۸ لاکھ ۲ ہزار	۱۶۸ کروڑ ۹۹ لاکھ 〃
۱۹۵۰ء	۹۴ لاکھ ۱۶ ہزار	۱۹۴ کروڑ ۸۷ لاکھ 〃
۱۹۵۱ء	۱ کروڑ ۴۸ لاکھ ۱۷ ہزار	۲۴۴ کروڑ ۵۸ لاکھ 〃
۱۹۵۲ء	۶۰ لاکھ ۶۱ ہزار	۲۰۸ کروڑ ۵۱ لاکھ 〃
۱۹۵۳ء	۶۸ لاکھ ۸۹ ہزار	۲۳۰ کروڑ ۹۸ لاکھ 〃
۱۹۵۴ء	۶۳ لاکھ ۱۰ ہزار	۲۵۲ کروڑ ۵۰ لاکھ 〃
۱۹۵۵ء	۱ کروڑ ۱۵ لاکھ ۶۲ ہزار	۲۹۶ کروڑ ۵۴ لاکھ 〃
۱۹۵۶ء	۱ کروڑ ۳۶ لاکھ ۲۹ ہزار	۳۴۰ کروڑ ۷۵ لاکھ 〃
۱۹۵۷ء	۱ کروڑ ۲ لاکھ ۱۴ ہزار	۳۵۳ کروڑ ۴۴ لاکھ 〃
۱۹۵۸ء	۷۶ لاکھ ۵۸ ہزار	۳۶۹ کروڑ ۲۵ لاکھ 〃
۱۹۵۹ء	۱ کروڑ ۲۲ لاکھ ۷۲ ہزار	۳۸۰ کروڑ ۵ لاکھ 〃
۱۹۶۰ء	۱ کروڑ ۲۹ لاکھ ۶۰ ہزار	۴۱۴ کروڑ ۸۸ لاکھ 〃
۱۹۶۱ء	۱ کروڑ ۱۳ لاکھ ۳۰ ہزار	۴۰۲ کروڑ ۴۱ لاکھ 〃
۱۹۶۲ء	۱ کروڑ ۱۸ لاکھ ۴۱ ہزار	۴۰۷ کروڑ ۷۰ لاکھ 〃

سنہ ۱۹۶۳ء	۱ کروڑ ۳۲ لاکھ ۸۰ ہزار	۴۴۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے
سنہ ۱۹۶۴ء	۱ کروڑ ۴ لاکھ ۲۶ ہزار	۵۰۲ کروڑ ۴۸ لاکھ "
سنہ ۱۹۶۵ء	۹۸ لاکھ ۹۷ ہزار	۵۴۷ کروڑ ۷۶ لاکھ "
سنہ ۱۹۶۶ء	۹۲ لاکھ ۹۳ ہزار	۶۰۹ کروڑ ۷۵ لاکھ "
سنہ ۱۹۶۷ء مارچ	۸۲ لاکھ ۶۶ ہزار	۶۱۸ کروڑ ۵۵ لاکھ "

اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں زرِ محفوظ اور کرنسی میں ایک اور ۱۱۹ کی نسبت تھی۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں ایک اور ۴۸۲ کی ہوگئی اور سنہ ۱۹۶۷ء میں ایک اور ۷۴۸ تک پہنچ گئی۔ یہ افراطِ زر کی ایسی صورت حال ہے کہ اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت اور سنہ ۱۹۶۹ء میں چیزوں کے نرخ

نمبر شمار	نام اشیاء	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۶۹ء
۱	گندم	۱۰ ، ۲۱	۲۲ ، ۵۰
۲	آٹا	۱۰ ، ۸۳	۲۴ ، ۰۰
۳	چنے	۱۸ ، ۱۹	۲۷ ، ۰۰
۴	چاول اعلیٰ	۲۴ ، ۶۸	۶۰ ، ۰۰
۵	چاول وڑا	۲۰ ، ۸۷	۵۰ ، ۰۰
۶	دال ماش	۰ ، ۵۱	۱ ، ۲۵
۷	دال مسور	۰ ، ۲۸	۱ ، ۰۰
۸	دال مونگ	۰ ، ۴۱	۱ ، ۲۵
۹	دال چنے	۰ ، ۲۶	۰ ، ۸۷
۱۰	چینی راشن	۲۰ ، ۰۰	۷۵ ، ۰۰
۱۱	شکر	۱۹ ، ۰۰	۳۱ ، ۰۰
۱۲	گڑ	۱۵ ، ۶۶	۳۰ ، ۰۰
۱۳	گوشت گائے	۰ ، ۷۵	۱ ، ۷۵
۱۴	گوشت بکری	۱ ، ۵۰	۵ ، ۰۰
۱۵	انڈے درجن	۱ ، ۲۵	۳ ، ۷۵

نمبر شمار	نام اشیاء	سنہ ۱۹۴۷	سنہ ۱۹۶۹
۱۶	مرغی	۳،۲۱	۷،۵۰
۱۷	مچھلی رہو	۱،۰۶	۳،۲۵
۱۸	مرچ سیاہ	۱،۴۰	۹،۰۰
۱۹	الائچی خورد	۵،۹۶	۲۴۰،۰۰
۲۰	ہلدی	۰،۶۲	۳،۰۰
۲۱	لونگ	۲،۱۲	۳۲،۰۰
۲۲	مرچ سُرخ	۱،۳۴	۳،۵۰
۲۳	الائچی کلاں	۱،۹۸	۲۴،۰۰
۲۴	بادام	۱،۹۰	۵،۵۰
۲۵	کھوپرا	۱،۴۶	۵،۰۰
۲۶	مٹھائی دیسی گھی	۱،۵۰	۶،۰۰
۲۷	دودھ	۰،۴۱	۱،۰۰
۲۸	گھی دیسی	۱۵۸،۲۲	۳۰۵،۰۰
۲۹	لپٹن چائے	۱،۲۵	۹،۲۵
۳۰	تیل سرسوں	۱،۰۶	۳،۰۰
۳۱	لکڑی سوختنی	۲،۸۷	۵،۰۰
۳۲	کوئلہ	۳،۸۷	۱۳،۰۰
۳۳	پاپلین سفید	۱،۱۷	۲،۶۲

نمبر شمار	نام اشیاء	سنہ ۱۹۴۷ء	سنہ ۱۹۶۹ء
۳۴	لٹھا	۱،۲۵	۲،۳۷
۳۵	سنلائٹ	۰،۲۰	۰،۶۰
۳۶	لکس	۰،۲۸	۰،۶۹
۳۷	لائف بوائے	۰،۲۸	۰،۶۰
۳۸	دیسی صابن	۴۰،۰۰	۵۸،۰
۳۹	سونا	۷۶،۳۴	۱۵۸،۰۰
۴۰	پانی (ٹنکہ)	۱،۵۰	۴،۰۵
۴۱	بجلی (یونٹ)	۰،۲۲	۰،۲۸
۴۲	سائیکل (ریلے)	۱۲۸،۰۰	۲۵۵،۰۰
۴۳	لفافہ ڈاک	۰،۰۹	۰،۱۵
۴۴	پوسٹ کارڈ	۰،۰۵	۰،۱۰
۴۵	رجسٹری	۰،۱۹	۰،۵۰
۴۶	سگریٹ کیپسٹن	۰،۳۵	،۹۰
۴۷	سگریٹ قینچی	۰،۲۴	۰،۳۸
۴۸	سگریٹ تار	۰،۰۴	۰،۱۶
۴۹	سگریٹ لیمپ	۰،۰۴	۰،۱۶
۵۰	سگریٹ پاسنگ شو	۰،۱۶	۰،۲۵

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

مملکتِ خداداد پاکستان میں حق و باطل کی آویزش
اور
دین پسند قوتوں اور لادین عناصر کی کشمکش
کی اس نازک گھڑی میں اپنا فرض ادا کرنے کیلئے

ہفت روزہ آئین لاہور

اپنی روایات کے جلو میں، نئے پیرہن اور نئے اسلوب کے ساتھ
باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

ھ آئین اس ملک میں اسلامی قوتوں پر حملہ آور گروہوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے
اور سوشلزم کے علمبرداروں کی اصل تصویر سامنے لانے کا کردا
ھ آئین خود پڑھیے اور دوسروں تک اس کی آوا

فی پرچہ : ۳۵ پیسے ـــــ سالانہ : بیس روپے
(بشمول سہ خصوصی اشاعتیں)

ہفت روزہ آئین نسیم مارکیٹ ۲۱ ریلوے روڈ، لاہور